سہ ماہی

صالحات

خواتین کے لیے

نگران
حسن الیاس

مدیر: نعیم احمد بلوچ

جلد: 3 شمارہ: 3 جولائی تا ستمبر 2026ء

علم و آگہی اور شعور و تربیت

مغرب کا عام شہری فلسفہ نہیں پڑھتا۔ وہ بین الاقوامی قانون کی دفعات بھی نہیں جانتا۔ لیکن وہ ایک ماں کی چیخ سنتا ہے۔ وہ ایک باپ کو اپنے بچے کی لاش اٹھائے دیکھتا ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر کو بے ہوشی کے بغیر بچے کا آپریشن کرتے دیکھتا ہے۔ وہ ایک شہر کو قبرستان بنتے دیکھتا ہے۔ پھر وہ اپنی حکومت سے پوچھتا ہے: آپ کس کے ساتھ کھڑے ہیں؟ یہ سوال حکومتوں کو پریشان کر رہا ہے۔ دوسری وجہ بین الاقوامی قانون ہے۔ اسرائیل اب صرف سیاسی تنقید کا سامنا نہیں کر رہا، وہ قانونی دباؤ کا بھی سامنا کر رہا ہے۔ بین الاقوامی عدالتوں میں مقدمات، گرفتاری کے وارنٹ، جنگی جرائم کی بحث، انسانی حقوق کے معاہدے؛ یہ سب یورپی حکومتوں کے لیے خاموش رہنا مشکل بنا رہے ہیں۔ جو ملک خود کو انسانی حقوق کا علمبردار کہتے ہیں، وہ ہمیشہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قانون صرف کمزوروں کے لیے ہے اور طاقتور دوستوں کے لیے نہیں۔

(قصہ مختصر)

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

علم و آگہی اور شعور و تربیت

سہ ماہی

صالحات

خواتین کے لیے

نگران

حسن الیاس

جلد: 3 شمارہ: 3 جولائی تا ستمبر 2026ء

مدیر: نعیم احمد بلوچ نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

مجلس ادارت

ارم نبی، بینش سلیم، ثوبیہ نورین، غزل چودھری، نکہت ستار

مجلس مشاورت

کوکب شہزاد، منیزہ ہاشمی، نسرین آفتاب، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر عظمیٰ عثمان

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

سہ ماہی
صالحات
علم و آگہی اور شعور و تربیت

نگران: حسن الیاس
مدیر: نعیم احمد بلوچ

فہرست مضامین

1۔ قرآن کا تصورِ زوجین	استاد جاوید احمد غامدی	04
2۔ قبروں کو عبادت گاہ بنانے کی ممانعت: احادیثِ نبوی کی روشنی	محمد حسن الیاس / نعیم احمد بلوچ	07
3۔ اسرائیل کی اخلاقی رعایت ختم ہو رہی ہے	مدیر کے قلم سے	16
4۔ عطیہ فیضی: عروج کی محفلوں سے زوال کی تنہائی تک	وجیہہ حسان واحدی	21
5۔ توازن کیسے ہو؟	کوکب شہزاد	31
6۔ آئینے کا شہر	نعیم احمد بلوچ	37
7۔ کھیتی	معاذ بن نور	42
8۔ خیر سے شر تک کا سفر۔ کیسے؟	ثوبیہ نورین	45
9۔ غزل	حمیرا رحمان	54
10۔ بڑا بھائی	عائشہ کلیم	55
11۔ وَدھ	عائشہ کلیم	61

تعلیم القرآن

استاذ جاوید احمد غامدی

قرآن کا تصورِ زوجین

وَمِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ (الذاریات ۵۱: ۴۹)

اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تا کہ تم یاد دہانی حاصل کرو

یہ صرف مرد و عورت نہیں ہیں، جنھیں زوجین (جوڑا جوڑا) کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ اِس دنیا کی ہر چیز اِسی طرح پیدا ہوئی ہے، لہٰذا سب جوڑا جوڑا ہیں، الاّ (مگر) یہ کہ وہ اِنھی میں سے کسی جوڑے کے تکملہ اور تتمہ (کمپلیمنٹ) کے طور پر پیدا کی گئی ہوں۔ انسان اگر دقت نظر کے ساتھ غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ نفس (عام معنوں میں روح) اور مادہ ہو، نباتات و حیوانات (پلانٹ اور اینیمل) ہوں، نوع انسانی ہو یا قرآن کی سورتیں، خدا کی مخلوقات میں ہر جگہ تزویج (جوڑے جوڑے) کا یہی اصول کار فرما ہے۔ یہاں تک کہ مادے کی بنیادی ترکیب (نیوکلیس) میں بھی مثبت (پلس) اور منفی (مائنس) برقی توانائی کا ربط و نظام ہی نتیجہ خیز ہو رہا ہے۔ پھر یہی نہیں، اِس سے آگے دیکھیے تو فرد اجتماع کے ساتھ، محنت سرمایے کے ساتھ، علل اپنے معلولات (کاز اینڈ ایفکٹس) کے ساتھ، قوی آلات (سکلز اینڈ انسٹرومنٹس) کے ساتھ، طبائع ارادوں (ہیومن نیچرز اینڈ انٹنشنز) کے ساتھ اور ارواح بھی اِسی طرح اپنے اجسام کے ساتھ جڑے ہوئے زوجین ہی کی صورت میں نظر آئیں گے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تا کہ تم یاد دہانی حاصل کرو

مدعا (مطلب) یہ ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے اور اِسی حیثیت سے اپنی معنویت (مینگز) کا اظہار کرتی ہے تو خود دنیا کو بھی اپنا جوڑا چاہیے، جس سے وہ ایک بامقصد اور بامعنی چیز بنے۔ قرآن جس آخرت کی منادی (اعلان) کرتا

ہے، یہ اُس کے وجوب (ثبوت) پر قرآن کا استدلال (دلیل) ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اُس نے اِسی مقصد سے اِس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے، لیکن غور کیجیے تو ایک دوسری حقیقت بھی اِس کے نتیجے میں آپ سے آپ واضح ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ انسان کی تمام تگ ودو (جدوجہد) کا ہدف اُس کی دنیوی زندگی میں بھی یہی ہونا چاہیے کہ وہ ہر شے، ہر فکر، ہر حرکت اور ہر خیال کے زوجین دریافت کرے، پھر دیکھے کہ وہ کس لحاظ سے زوج زوج (پیئرز) ہوئے ہیں، اُن کے مابین کیا پہلو تضادات (مختلف) کے اور کیا توافق (مطابق) کے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہوتے اور نئے زوجین کے تولد (پیدائش) کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مرد وعورت کے باہمی تعلق سے جو معاشرت پیدا ہوتی ہے، اُس میں بھی زوجین کے اِس تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔ فرد اور اجتماع (سوسائیٹی) کے تعلق سے جو سیاست وجود میں آتی ہے، اُس کا بھی یہی تقاضا ہے۔ محنت اور سرمایہ جس معیشت کو وجود میں لاتے ہیں، اُس کا فہم بھی اِسی پر منحصر ہے۔

یہ کوئی جدلیات (ڈائلکٹس۔ بحث و گفتگو کا نتیجہ) نہیں ہے، جسے بعض فلسفیوں نے دریافت کر لینے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ زوج کے اندر زوج کی طلب ہے، جو اُنھیں زوجین بن جانے کے لیے مجبور کر دیتی، اور اِس طرح تضادات سے توافق اور توافق سے تضادات کی صورت میں نئے زوجین پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔

دنیا کی فطرت یہی ہے۔ اِس کو سمجھے بغیر اگر علم و عمل کا کوئی نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اُس کا حاصل محض انتہا پسندی ہو گی۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم اور اب فیمنزم وغیرہ، یہ سب اِسی کی مثالیں ہیں۔ فلسفہ کے مختلف مدارس (سکولز آف تھاٹس) کا مطالعہ کیجیے تو وہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ اِس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ زندگی کا حسن توازن (بیلینس) ہے اور یہ اُسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب ہم چیزوں کو اُن کی منفرد صورت میں دیکھنے کے بجاے اُنھیں زوجین کی صورت میں دیکھیں۔ پھر جو تعلق اُن میں پیدا ہوا ہے، اُس کو سمجھیں کہ اُس کی نوعیت کیا ہے، پھر اُسی کے مطابق اُن سے معاملہ کرنے کی سعی کریں۔

یہی علم حقیقی ہے، جو دنیا اور آخرت، دونوں میں انسان کو صلاح و فلاح سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ خدا کی شریعت اِسی علم کو لے کر نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ تمھارے پروردگار نے جب اِس کائنات کو بنایا تو اُس میں میزان قائم کر دی، اِس لیے کہ لوگ بھی اپنے دائرۂ اختیار میں اِسی طرح میزان قائم رکھیں۔ اہل ایمان کے لیے قیام بالقسط کا حکم، جسے قرآن میں ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے، اِسی ہدایت کی ایک تعبیر ہے:

تعلیم القرآن

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ، اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ، وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ
بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ

(الرحمٰن:55)

اور اُس نے آسمان کو اونچا کیا اور اُس میں میزان قائم کر دی کہ (اپنے دائرۂ اختیار میں) تم بھی میزان میں خلل نہ ڈالو اور انصاف کے ساتھ سیدھی تول تولو اور وزن میں کمی نہ کرو۔

تعلیم الحدیث

ترجمہ و تحقیق: محمد حسن الیاس
اخذ و استفادہ: نعیم بلوچ

قبروں کو عبادت گاہ بنانے کی ممانعت: احادیثِ نبوی کی روشنی

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا[1]، قَالَتْ: لَمَّا اشْتَكَى النَّبِيُّ ﷺ ذَكَرَتْ بَعْضُ نِسَائِهِ كَنِيسَةً رَأَيْنَهَا بِأَرْضِ الْحَبَشَةِ، يُقَالُ لَهَا: مَارِيَةُ، وَكَانَتْ أُمُّ سَلَمَةَ وَأُمُّ حَبِيبَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، أَتَتَا أَرْضَ الْحَبَشَةِ فَذَكَرَتَا مِنْ حُسْنِهَا وَتَصَاوِيرَ فِيهَا، فَرَفَعَ رَأْسَهُ، فَقَالَ: «أُولَئِكَ [قَوْمٌ][2] إِذَا مَاتَ مِنْهُمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، ثُمَّ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّورَةَ، أُولَئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ [يَوْمَ الْقِيَامَةِ»][3].

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوئے تو آپ کی کسی بیوی نے اُس گرجے کا ذکر کیا جو اُنھوں نے سرزمین حبشہ میں دیکھا تھا اور جس کا نام ”ماریہ“ تھا۔ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے) ام سلمہ اور ام حبیبہ چونکہ حبشہ جا چکی تھیں تو اُنھوں نے بھی اُس گرجے کی خوب صورتی اور اُس میں تصویروں کے بارے میں بیان کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو اپنا سر اٹھایا اور

ارشاد فرمایا: وہ اِسی طرح کے لوگ ہیں کہ جب اُن میں کوئی صالح آدمی مر جاتا ہے تو اُس کی قبر پر کوئی عبادت گاہ تعمیر کرتے، پھر اُس میں وہ صورت بنا لیتے تھے[1]۔ قیامت کے دن یہی لوگ اللہ کے نزدیک بدترین خلائق ہوں گے[2]۔

۱۔ یعنی وہ صورت جس کا ذکر تم دونوں حبشہ کے گرجے سے متعلق کر رہی ہو۔

۲۔ یعنی وہ بھی جو قبروں پر عبادت گاہیں بناتے اور وہ بھی جو اپنے صالحین کی تصویریں اُن میں آویزاں کرتے ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ اِسی نوعیت کی تصویریں ہیں، جن کے بنانے والوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی اور اُنھیں عذاب کی وعید سنائی ہے۔

عَنْ أَبِي مَرْثَدٍ الْغَنَوِيِّ[1]، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تَجْلِسُوا عَلَى الْقُبُورِ، وَلَا تُصَلُّوا إِلَيْهَا

ابو مرثد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
قبروں پر نہ بیٹھا کرو اور نہ اُن کی طرف رخ کر کے کبھی نماز پڑھو[1]۔

۱۔ یہ، ظاہر ہے کہ سد ذریعہ کا حکم ہے اور اِس لیے دیا گیا ہے کہ یہ قبریں کسی وقت لوگوں کے لیے سجدہ گاہ نہ بن جائیں، اور اِس کے نتیجے میں وہ شرک جیسے جرم کے مرتکب ہونے لگیں۔ چنانچہ یہی ہدایت ہے، جس کی خلاف ورزی کے نتائج ہم بعد کے زمانوں میں صالحین کے مقبروں پر دیکھتے ہیں۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ[1]، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَأَنْ يَجْلِسَ أَحَدُكُمْ عَلَى جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِيَابَهُ فَتَخْلُصَ إِلَى جِلْدِهِ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَجْلِسَ عَلَى قَبْرِ [رَجُلٍ مُسْلِمٍ»][2].

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی آگ کے دہکتے انگارے پر بیٹھ جائے، پھر وہ اُس کے کپڑے جلا دے اور اُس کی کھال تک پہنچ جائے، یہ اِس سے بہتر ہے کہ وہ کسی مسلمان کی قبر پر بیٹھے[1]۔

۱۔ یعنی دعا و مناجات کے لیے یا معتکف ہو کر بیٹھے۔ یہ ظاہر ہے کہ عبادت ہی کی ایک صورت ہے جو نہ کسی جگہ کو تھان قرار دے کر کبھی جائز ہو سکتی ہے اور نہ غیر اللہ کے لیے۔

عَنْ عَائِشَةَ،[1] قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي مَرَضِهِ الَّذِي لَمْ يَقُمْ مِنْهُ: «لَعَنَ اللهُ[2] الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ»[3]، قَالَتْ: فَلَوْلَا ذَاكَ أُبْرِزَ قَبْرُهُ، غَيْرَ أَنَّهُ خُشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا.

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جس بیماری سے جان بر نہیں ہو سکے، اُس میں آپ نے فرمایا: اللہ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی ہے، اِس لیے کہ اُنھوں نے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ اِس کے بعد سیدہ نے کہا: چنانچہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ کی قبر کو کھلا رہنے دیا جاتا، مگر اِس کا اندیشہ تھا کہ اُس کو بھی اِسی طرح سجدہ گاہ بنا لیا جائے گا[1]۔

۱۔ یہ سیدہ نے اِس کی وجہ بیان کی ہے کہ آپ کی قبر بند کمرے میں کیوں بنائی گئی۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْحَارِثِ النَّجْرَانِيِّ، قَالَ: حَدَّثَنِي جُنْدَبٌ،[1] قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ قَبْلَ أَنْ يَمُوتَ بِخَمْسٍ، وَهُوَ يَقُولُ: «إِنِّي أَبْرَأُ إِلَى اللهِ، أَنْ يَكُونَ لِي مِنْكُمْ خَلِيلٌ، فَإِنَّ اللهَ تَعَالَى، قَدِ اتَّخَذَنِي خَلِيلًا، كَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ أُمَّتِي خَلِيلًا، لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا، أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، كَانُوا يَتَّخِذُونَ قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ، إِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذَلِكَ».

عبد اللہ بن حارث نجرانی، جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے بتایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات سے پانچ روز قبل یہ

فرماتے ہوئے سنا کہ میں اللہ کے حضور اِس چیز سے براءت کا اظہار کرتا ہوں کہ تم میں سے کوئی میرا خلیل ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اُسی طرح اپنا خلیل بنا لیا ہے، جس طرح اُس نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا[1]۔ اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابو بکر ہی کو خلیل بناتا۔ تم خبردار رہو، تم سے پہلے لوگ اپنے پیغمبروں اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے، کہیں تم اِن قبروں کو عبادت گاہ نہ بنا بیٹھنا، میں تم لوگوں کو اِس بات سے منع کرتا ہوں۔

۱۔ یعنی اپنے ساتھ دوستی کے لیے خاص کر لیا تھا، اور جب اللہ کسی کو اپنے ساتھ دوستی کے لیے خاص کر لے تو کوئی دوسرا اُس کا خلیل کس طرح ہو سکتا ہے؟

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ[1].

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر چونا لگانے، اُس پر بیٹھنے اور عمارت بنانے سے منع فرمایا[1]۔

۱۔ اِس ہدایت سے بھی یہی مقصود تھا کہ قبریں لوگوں کے لیے زیارت گاہوں کی صورت اختیار نہ کر لیں کہ مبادا وہ اُنھیں سجدہ گاہ بنانے لگیں۔

وضاحت

اللہ کے دین میں توحید ایمانیات کی بنیاد ہے۔ اِس کا تقاضا یہ ہے کہ بندگی، سجدہ، دعا، نذر، استعانت اور عبادت کی تمام صورتیں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف شرک سے روکا، بلکہ اُن تمام راستوں کو بھی بند کیا جو رفتہ رفتہ انسان کو شرک تک پہنچا سکتے تھے۔ قبروں کے بارے میں آپ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کو اپنے فوت شدگان کی تکریم، اُن کے لیے دعا، اُن کی مغفرت کی درخواست اور موت کی یاد دہانی کے لیے قبروں کی زیارت کی اجازت دی، بلکہ بعض روایات میں اِس کی ترغیب بھی ملتی ہے۔

لیکن اِس کے ساتھ آپ نے پوری شدت سے اِس بات سے منع فرمایا کہ قبروں کو عبادت گاہ، سجدہ گاہ، اعتکاف گاہ، زیارت گاہِ تقدیس یا مذہبی مرکز بنالیا جائے۔ اِس لیے کہ یہی وہ دروازہ ہے جس سے پچھلی امتوں میں صالحین کی محبت آہستہ آہستہ اُن کی پرستش میں بدل گئی۔

پچھلی امتوں کا انحراف

پہلی روایت جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی گئی ہے، اس میں اسی جانب اشارہ ہے۔ یہ حدیث نہایت اہم ہے، کیونکہ اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے ایک تاریخی عمل کو بے نقاب کیا ہے۔ ابتدا میں نیک لوگوں سے محبت ہوتی ہے۔ پھر اُن کی قبروں کو خاص حیثیت دی جاتی ہے۔ پھر وہاں عمارت بنائی جاتی ہے۔ پھر اُن کی تصویریں، شکلیں یا آثار آویزاں کیے جاتے ہیں۔ پھر آنے والی نسلیں اُن مقامات کو عبادت، دعا، تبرک اور حاجت روائی کے مراکز سمجھنے لگتی ہیں۔ اِس طرح محبت سے شروع ہونے والا عمل عقیدت، پھر تقدیس، پھر عبادت اور آخر کار شرک تک پہنچ جاتا ہے۔

یہاں تصویروں سے متعلق ممانعت کا پس منظر بھی واضح ہوتا ہے۔ ہر تصویر کا مسئلہ یکساں نہیں، بلکہ خاص طور پر وہ تصویریں مراد ہیں جو مذہبی تقدیس، عبادت گاہوں، قبروں اور صالحین کی غیر معمولی تعظیم کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ یہی وہ تصویریں ہیں جو عقیدے کے فساد کا ذریعہ بنتی ہیں، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر سخت وعید فرمائی۔

قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت

ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبروں پر نہ بیٹھو اور نہ اُن کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔

یہ حکم محض ظاہری بے ادبی سے بچانے کے لیے نہیں، بلکہ اِس کے پیچھے ایک بڑا دینی اصول ہے۔ اگر کوئی شخص قبر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے تو وقت گزرنے کے ساتھ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ نماز اللہ کے لیے نہیں بلکہ اُس قبر یا صاحبِ قبر کی نسبت سے پڑھی جا رہی ہے۔ اِس طرح عبادت کی سمت اور نفسیاتی تعلق میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ اسلام عبادت کو ہر قسم کے اشتباہ سے پاک رکھنا چاہتا ہے۔ اِس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی طرف نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔

یہ سدِ ذریعہ کا حکم ہے، یعنی ایسے ذریعے کو بند کرنا جو آگے چل کر کسی بڑے دینی فساد تک پہنچا سکتا ہو۔ شریعت کا مزاج یہی ہے کہ وہ صرف آخری جرم سے منع نہیں کرتی، بلکہ اُس کے مقدمات اور راستوں کو بھی بند کرتی ہے۔ شرک چونکہ سب سے بڑا دینی جرم ہے، اس لیے اُس کی طرف لے جانے والے راستوں کو بھی نہایت سنجیدگی سے بند کیا گیا۔

قبر پر بیٹھنے کی ممانعت

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت قبر پر بیٹھنے کی ممانعت ہے۔ عام طور پر اِس حدیث سے قبر کی بے حرمتی کی ممانعت سمجھی جاتی ہے، اور یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ قبر مسلمان کی حرمت کا مقام ہے۔ زندہ مسلمان کی طرح مردہ مسلمان کی بھی ایک حرمت ہے۔ اُس کی قبر کو پامال کرنا، اُس پر بیٹھنا، اُسے معمولی جگہ سمجھنا یا اُس کی بے توقیری کرنا اسلامی ادب کے خلاف ہے۔

لیکن دیے گئے حواشی کی روشنی میں اِس ممانعت کا ایک دوسرا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ قبر پر بیٹھنے سے مراد صرف عام بیٹھنا نہیں، بلکہ دعا، مناجات، مراقبے یا اعتکاف کی نیت سے بیٹھنا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ طرزِ عمل قبر کو عبادت گاہ یا روحانی تھان بنانے کی ابتدا بن سکتا ہے۔ اسلام کسی خاص قبر کو اِس معنی میں روحانی مرکز بنانے کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان وہاں بیٹھ کر صاحبِ قبر سے نسبت قائم کرے، اُس کے وسیلے سے حاجات طلب کرے، یا اُس جگہ کو مستقل عبادت و مناجات کا مرکز بنا لے۔ لہٰذا قبر پر بیٹھنے کی ممانعت میں احترامِ قبر بھی شامل ہے اور شرک کے راستوں کی بندش بھی۔

نبیوں اور صالحین کی قبروں کو مسجد بنانے کی ممانعت

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری بیماری میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی، کیونکہ اُنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔

یہ حدیث بہت فیصلہ کن ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو اُس انحراف سے بچانا چاہتے تھے جس میں پچھلی امتیں مبتلا ہوئیں۔ اُنھوں نے اپنے نبیوں اور صالحین کی محبت میں اُن کی قبروں کو عبادت کا مرکز بنا لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے ہی اِس خطرے کی نشان دہی کر دی تاکہ آپ کی امت آپ کی قبر کے معاملے میں بھی حد سے تجاوز نہ کرے۔

اسی بنا پر آپ کی قبر مبارک عام کھلے قبرستان میں نہیں بنائی گئی، بلکہ اُسی حجرے میں تدفین ہوئی جہاں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اِس کی حکمت یہی بیان کی کہ آپ کی قبر کو مسجد یا سجدہ گاہ بنا لینے کا اندیشہ تھا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے معاملے میں بھی اصل اصول یہی تھا کہ احترام ہو، محبت ہو، سلام ہو، درود ہو، لیکن عبادت کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہونے پائے۔

وفات سے پانچ دن پہلے کی تاکید

جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پانچ روز قبل کچھ نصیحتیں فرمائیں۔

یہ روایت اپنے موقع کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کوئی معمولی نصیحت نہیں جو عام حالات میں فرمائی گئی ہو، بلکہ وفات سے صرف پانچ دن پہلے، آخری نصیحتوں میں سے ایک نصیحت ہے۔ ایسے وقت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات امت کے لیے خاص وزن رکھتی ہے۔ آپ نے اپنی امت کو واضح طور پر خبردار کیا کہ پچھلی قوموں کی غلطی نہ دہرائی جائے۔

یہاں دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ پہلی یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی عظمت کے باوجود اپنی امت کو اپنی ذات کے معاملے میں بھی غلو سے روکا۔ دوسری یہ کہ آپ نے نبیوں اور صالحین دونوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنانے سے منع فرمایا۔ یعنی خطرہ صرف نبیوں کی قبروں تک محدود نہیں؛ صالحین، شہدا، علما اور بزرگوں کی قبروں کے بارے میں بھی یہی اصول ہے۔

قبر پر عمارت بنانے، چونا لگانے اور اُسے نمایاں کرنے کی ممانعت

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت میں وہ حکم ہے جس کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ یہ حکم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قبر پر عمارت بنانا، اُسے پختہ کرنا، اُسے غیر معمولی طور پر نمایاں کرنا، اُس پر گنبد، مقبرہ یا شان دار تعمیر بنانا—یہ سب اعمال رفتہ رفتہ قبر کو عام یاد دہانی کے مقام سے اٹھا کر مذہبی تقدیس کے مقام میں بدل دیتے ہیں۔ جب قبر عمارت بن جاتی ہے تو اُس کی طرف سفر شروع ہوتا ہے، پھر وہاں چراغ، پردے، چادریں، نذریں، مخصوص دعائیں اور مخصوص رسوم پیدا ہوتی ہیں۔ یوں قبر موت کی یاد دلانے کے بجائے ایک مذہبی مرکز بن جاتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو سادہ رکھنے کی ہدایت اسی لیے دی کہ مسلمان موت کو یاد رکھیں، فوت شدگان کے لیے دعا کریں، مگر قبروں کو تقدیس اور عبادت کے مراکز نہ بنا بیٹھیں۔

اصل مسئلہ قبر نہیں، قبر کے ساتھ مذہبی رویہ ہے

یہاں ایک اہم بات سمجھنی چاہیے۔ اسلام قبروں کی بے حرمتی نہیں چاہتا۔ وہ مردوں کے احترام کا حکم دیتا ہے، اُن کے لیے دعا کی تعلیم دیتا ہے، جنازہ پڑھاتا ہے، تدفین کا باوقار طریقہ بتاتا ہے، قبرستان جانے کو موت کی یاد کا ذریعہ بناتا ہے۔ لیکن اسلام قبروں کو عبادت، حاجت روائی، روحانی طاقت، مشکل کشائی یا غیبی تصرفات کا مرکز بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔

فرق بہت واضح ہے۔
قبر پر جانا جائز ہے، مگر قبر کو عبادت گاہ بنانا ناجائز ہے۔
صاحبِ قبر کے لیے دعا جائز ہے، مگر صاحبِ قبر سے دعا مانگنا ناجائز ہے۔
فوت شدہ نیک آدمی سے محبت فطری ہے، مگر اُس کی قبر کو تقدس کا مرکز بنالینا ناجائز ہے۔
قبرستان موت کی یاد کے لیے ہے، روحانی آستانہ بنانے کے لیے نہیں۔
صالحین کی سیرت سے سبق لینا مطلوب ہے، اُن کی قبروں کو مرکزِ عقیدت بنالینا ممنوع ہے۔
یہی وہ بنیادی فرق ہے جسے نظر انداز کرنے سے امتوں میں انحراف پیدا ہوا۔

سدِ ذریعہ کا اصول

اِن تمام احادیث میں ایک مشترک اصول کار فرما ہے، اور وہ ہے سدِ ذریعہ۔ یعنی ہر وہ راستہ بند کر دینا جو آگے چل کر شرک، غلو یا بدعت کا ذریعہ بن سکتا ہو۔ قبر پر نماز پڑھنا، قبر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا، قبر پر عمارت بنانا، قبروں کو عبادت گاہ بنانا، وہاں تصویریں لگانا، وہاں بیٹھ کر خاص عبادتیں کرنا—یہ سب ایسے اعمال ہیں جو ابتدا میں شاید عقیدت یا محبت کے نام پر کیے جائیں، لیکن آخر کار عبادت کے رخ کو اللہ سے ہٹا کر غیر اللہ کی طرف موڑ سکتے ہیں۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خطرے کو دیکھتے ہوئے اپنے ماننے والوں کو سخت الفاظ میں منع فرمایا۔ آپ نے صرف یہ نہیں کہا کہ شرک نہ کرنا، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ اُن کاموں کے قریب بھی نہ جانا جو تمھیں شرک کے ماحول تک لے جائیں۔

صالحین کی محبت کا صحیح طریقہ

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نیک لوگوں، علما، شہدا اور صالحین سے محبت کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ احادیث کی روشنی میں اِس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی سیرت کو پڑھا جائے، اُن کے علم سے فائدہ اٹھایا جائے، اُن کے اخلاق کو اپنایا جائے، اُن کے لیے دعا کی جائے، اُن کے اچھے کام کو آگے بڑھایا جائے، مگر اُن کی قبروں کو دین کا مرکز نہ بنایا جائے۔

صالحین کی اصل عزت اُن کے راستے پر چلنے میں ہے، اُن کی قبروں کو آراستہ کرنے میں نہیں۔ انبیا کی اصل پیروی اُن کی تعلیمات کو ماننے میں ہے، اُن کے مزارات کو عبادت گاہ بنانے میں نہیں۔ اولیا سے حقیقی محبت اُن کے اخلاص، تقویٰ، خدمت، علم اور بندگی کو اختیار کرنے میں ہے، نہ کہ اُن کی قبروں پر رسمیں ایجاد کرنے میں۔

موجودہ صورت حال کے لیے تنبیہ

بعد کے زمانوں میں مسلمانوں کے ہاں بھی بعض مقامات پر وہی طرزِ عمل پیدا ہوا جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبردار کیا تھا۔ قبروں پر عمارتیں بنیں، گنبد تعمیر ہوئے، چادریں چڑھیں، مخصوص ایام مقرر ہوئے، منتیں مانی گئیں، حاجات طلب کی گئیں، اور بعض مقامات پر صاحبِ قبر کو اللہ کے حضور دعا کرنے کے بجائے براہ راست پکارا جانے لگا۔ یہ سب وہ امور ہیں جن سے توحید کا چہرہ دھندلا پڑتا ہے۔

مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی عقیدت کو شریعت کے تابع رکھے۔ محبت اگر وحی کی حدود میں رہے تو عبادت بن جاتی ہے، اور اگر حدود سے نکل جائے تو غلو اور شرک کا راستہ کھول دیتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہمیں یہی اعتدال سکھاتی ہیں۔

قصہ مختصر

نعیم احمد بلوچ

اسرائیل کی اخلاقی رعایت ختم ہو رہی ہے

یورپ بدل رہا ہے۔

یہ تبدیلی ایک دن میں نہیں آئی۔ یہ کسی ایک تقریر، ایک قرارداد یا ایک مظاہرے کا نتیجہ بھی نہیں۔ یہ تبدیلی غزہ کے ملبے، بچوں کی لاشوں، اسپتالوں کی تباہی، بھوک سے بلکتے خاندانوں اور مسلسل بمباری کی تصویروں سے پیدا ہوئی ہے۔

اسرائیل کئی دہائیوں تک مغرب میں ایک خاص اخلاقی رعایت سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ ہولوکاسٹ کا پس منظر اس کے ساتھ تھا۔ عرب ریاستوں کی دشمنی کا بیانیہ اس کے ساتھ تھا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ماحول اس کے ساتھ تھا۔ امریکا کی بے پناہ حمایت اس کے ساتھ تھی۔ یورپ بھی اکثر اسرائیل کو ایک ایسی ریاست سمجھتا تھا جو دشمنوں میں گھری ہوئی ہے اور اسے اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔ لیکن اب سوال بدل گیا ہے۔

اب سوال یہ نہیں رہا کہ اسرائیل کو دفاع کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ دفاع کے نام پر ایک پوری آبادی کو سزا دینے کا حق کس نے دیا؟ سوال یہ ہے کہ حماس کے جنگجوؤں اور غزہ کے بچوں میں فرق کیوں نہیں کیا گیا؟ سوال یہ ہے کہ دہشت گردی کا جواب اگر اجتماعی تباہی سے دیا جائے تو پھر قانون، اخلاق اور تہذیب کہاں رہ جاتے ہیں؟ یہی وہ نقطہ ہے جہاں یورپ کی رائے بدلنا شروع ہوئی۔

اسرائیل کے قیام کے بعد یورپ نے اس سے اختلاف پہلے بھی کیا تھا۔ فرانس نے کبھی اسلحہ روکا۔ یورپی یونین نے بستیوں پر اعتراض کیا۔ دو ریاستی حل کی بات بھی برسوں سے ہوتی رہی۔ لیکن اس بار فرق یہ ہے کہ مخالفت صرف سفارتی فائلوں میں نہیں رہی۔ یہ پارلیمانوں، عدالتوں، یونیورسٹیوں، میڈیا، سڑکوں اور عام شہریوں تک پھیل گئی ہے۔

بعض یورپی ملکوں نے فلسطین کو تسلیم کیا۔ بعض نے اسرائیل کو اسلحہ دینے پر سوال اٹھایا۔ بعض عدالتوں نے حکومتوں سے پوچھا کہ آپ ایسے ملک کو ہتھیار کیوں دے رہے ہیں جس پر جنگی جرائم کے الزامات ہیں؟ حتیٰ کہ نیتن یاہو کے سفر اور فضائی راستوں پر بھی قانونی بحث شروع ہو گئی۔ یہ معمولی بات نہیں۔ یہ علامت ہے کہ اسرائیل کی وہ پرانی اخلاقی چھتری اب پھٹ رہی ہے جس کے نیچے وہ ہر سخت اقدام کو "دفاع" کہہ کر گزار لیتا تھا۔ اس تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ غزہ کا انسانی المیہ ہے۔

مغرب کا عام شہری فلسفہ نہیں پڑھتا۔ وہ بین الاقوامی قانون کی دفعات بھی نہیں جانتا۔ لیکن وہ ایک ماں کی چیخ سنتا ہے۔ وہ ایک باپ کو اپنے بچے کی لاش اٹھائے دیکھتا ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر کو بے ہوشی کے بغیر بچے کا آپریشن کرتے دیکھتا ہے۔ وہ ایک شہر کو قبرستان بنتے دیکھتا ہے۔ پھر وہ اپنی حکومت سے پوچھتا ہے: آپ کس کے ساتھ کھڑے ہیں؟ یہ سوال حکومتوں کو پریشان کر رہا ہے۔

دوسری وجہ بین الاقوامی قانون ہے۔ اسرائیل اب صرف سیاسی تنقید کا سامنا نہیں کر رہا، وہ قانونی دباؤ کا بھی سامنا کر رہا ہے۔ بین الاقوامی عدالتوں میں مقدمات، گرفتاری کے وارنٹ، جنگی جرائم کی بحث، انسانی حقوق کے معاہدے — یہ

سب یورپی حکومتوں کے لیے خاموش رہنا مشکل بنا رہے ہیں۔ جو ملک خود کو انسانی حقوق کا علمبردار کہتے ہیں، وہ ہمیشہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قانون صرف کمزوروں کے لیے ہے اور طاقتور دوستوں کے لیے نہیں۔

تیسری وجہ نیتن یاہو کی حکومت ہے۔ اسرائیل میں پہلے بھی سخت گیر حکومتیں آئیں، لیکن موجودہ حکومت نے اسرائیل کا چہرہ بہت بدل دیا ہے۔ انتہا پسند وزرا، آبادکاری کی پالیسی، فلسطینی ریاست کے امکان کی نفی، سخت زبان، غزہ میں بے رحمانہ فوجی کارروائیاں؛ ان سب نے اسرائیل کے دوستوں کو بھی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یورپ دوریاستی حل کی بات کرتا ہے، مگر نیتن یاہو کی سیاست اس راستے کو بند کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یورپ قانون کی بات کرتا ہے، مگر غزہ کی تباہی اس قانون کا مذاق بناتی دکھائی دیتی ہے۔

چوتھی وجہ یورپ کی داخلی سیاست ہے۔ یورپ میں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کے ساتھ انسانی حقوق کی تنظیمیں، طلبہ، صحافی، ادیب، بائیں بازو کی جماعتیں، چرچ کے بعض حلقے اور یہودی امن پسند گروہ بھی شامل ہیں۔ یہ سب اسرائیل دشمن نہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ یہودی دشمنی کو جرم سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہود دشمنی کے خلاف جنگ کا مطلب فلسطینی بچوں کی موت پر خاموشی نہیں ہو سکتا۔

یہاں مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کا کردار بہت اہم ہو جاتا ہے۔ مسلمان اگر واقعی چاہتے ہیں کہ اسرائیل انصاف پر مبنی اقدامات کرے، تو انہیں اپنی جدوجہد کو بہت واضح، مہذب اور اصولی بنانا ہوگا۔ انہیں ہر فورم پر یہ کہنا ہوگا کہ حماس کی دہشت گرد کارروائیاں قابل مذمت ہیں، شہریوں کو قتل کرنا جرم ہے، یرغمال بنانا جرم ہے، مگر اسی طرح غزہ کے عام لوگوں کو اجتماعی سزا دینا بھی جرم ہے۔ حماس اور فلسطینی عوام ایک چیز نہیں۔ اسرائیلی حکومت اور تمام یہودی ایک چیز نہیں۔ نیتن یاہو کی پالیسی اور ایک عام اسرائیلی شہری ایک چیز نہیں۔

یہ فرق بہت ضروری ہے۔ اگر مغرب کا مسلمان یہ فرق واضح نہیں کرے گا تو اس کی آواز کمزور ہو جائے گی۔ اگر وہ حماس کے ہر عمل کا دفاع کرے گا تو وہ فلسطینی بچوں کے حق میں اخلاقی مقدمہ ہار جائے گا۔ اگر وہ یہودیوں کے خلاف نفرت انگیز زبان استعمال کرے گا تو وہ اسرائیلی حکومت کو موقع دے گا کہ ہر تنقید کو "یہود دشمنی" قرار دے۔ اگر وہ قانون کے بجائے غصے کی زبان بولے گا تو اس کی بات پارلیمانوں اور عدالتوں تک نہیں پہنچے گی۔ مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کا بہترین رویہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تین باتوں پر ڈٹ جائیں۔

پہلی بات: شہریوں کا قتل ہر حال میں غلط ہے، چاہے وہ حماس کرے یا اسرائیل۔

دوسری بات: غزہ کے عام لوگوں کو حماس کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

تیسری بات: فلسطینیوں کو عزت، ریاست، آزادی اور سلامتی کا حق ہے، بالکل اسی طرح جیسے اسرائیلی شہریوں کو امن اور حفاظت کا حق ہے۔

یہ موقف کمزور نہیں، سب سے مضبوط موقف ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ پرامن مظاہرے کریں، اپنے منتخب نمائندوں کو خط لکھیں، قانونی اداروں سے رجوع کریں، انسانی حقوق کی تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کریں، یونیورسٹیوں میں مکالمہ کریں، یہودی امن پسندوں اور مسیحی انسانی حقوق گروہوں کے ساتھ اتحاد بنائیں، فلسطینیوں کے لیے امداد جمع کریں، مگر نفرت، سازشی زبان اور مذہبی اشتعال سے بچیں۔ انہیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ مغرب میں اخلاقی جنگ سڑک پر بھی لڑی جاتی ہے، عدالت میں بھی، میڈیا میں بھی، ووٹ کے ذریعے بھی اور زبان کے انتخاب کے ذریعے بھی۔

اور یاد رکھیں کہ آج اسرائیل کے خلاف یورپ میں جو فضا بن رہی ہے، وہ صرف مسلمانوں کی وجہ سے نہیں بنی۔ یہ انسانی ضمیر کی وجہ سے بنی ہے۔ لیکن مسلمان اس فضا کو مضبوط بھی کر سکتے ہیں اور کمزور بھی۔ اگر وہ انصاف کی زبان بولیں گے تو ان کی بات سنی جائے گی۔ اگر وہ نفرت کی زبان بولیں گے تو اسرائیل کے سخت گیر حلقے یہی کہیں گے: دیکھیں، ہم ٹھیک کہتے تھے۔

یہی نکتہ اصل ہے۔

اسرائیل کے سامنے آج سب سے بڑا خطرہ ایران، حماس یا حزب اللہ نہیں۔ سب سے بڑا خطرہ اس کی اخلاقی ساکھ کا خاتمہ ہے۔ وہ فوجی طور پر طاقتور ہے، ایٹمی صلاحیت رکھتا ہے، امریکا اس کے ساتھ کھڑا ہے، مگر جب دنیا کے عام لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ آپ مظلوم نہیں رہے بلکہ ظالم بن چکے ہیں، تو پھر ٹینک اور طیارے بھی آپ کو اخلاقی شکست سے نہیں بچا سکتے۔

نیتن یاہو شاید جنگ جیتنا چاہتے ہیں، لیکن وہ اسرائیل کی عالمی ساکھ ہار رہے ہیں۔

وہ حماس کو ختم کرنا چاہتے ہیں، مگر غزہ کی تباہی سے وہ نفرت کی نئی فصل بو رہے ہیں۔

وہ دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ اسرائیل دہشت گردی کے خلاف لڑ رہا ہے، مگر دنیا پوچھ رہی ہے: پھر بچے کیوں مر رہے ہیں؟

یہ سوال آسان نہیں۔ یہ سوال تل ابیب سے زیادہ لندن، پیرس، میڈرڈ، ڈبلن اور برسلز میں گونج رہا ہے۔

اور یہی اسرائیل کے لیے اصل بحران ہے۔ کیونکہ ریاستیں صرف فوج سے نہیں چلتیں۔ وہ اخلاقی جواز سے بھی چلتی ہیں۔

قصہ مختصر

اسرائیل کے پاس فوج ابھی بھی ہے، ٹیکنالوجی بھی ہے، امریکا بھی ہے، مگر اخلاقی جواز تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ یورپ کی حالیہ مخالفت اسی کمی کا اعلان ہے۔

اسرائیل اگر واقعی اپنی سلامتی چاہتا ہے تو اسے صرف حماس سے نہیں، اپنی پالیسیوں سے بھی لڑنا ہو گا۔ اسے دہشت گردوں اور عام شہریوں میں فرق کرنا ہو گا۔ اسے فلسطینیوں کو ایک قوم ماننا ہو گا، محض سیکورٹی مسئلہ نہیں۔ اسے طاقت کے نشے سے باہر آنا ہو گا۔

اور مغرب کے مسلمانوں کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھنی ہو گی۔ انہیں غصے کو دلیل میں، درد کو اخلاقی موقف میں، اور احتجاج کو قانونی جدوجہد میں بدلنا ہو گا۔ یہی راستہ فلسطین کے لیے بھی بہتر ہے، مغرب کے مسلمانوں کے لیے بھی، اور دنیا کے ضمیر کے لیے بھی۔

آج مسئلہ یہ نہیں کہ دنیا اسرائیل کو سمجھ نہیں رہی۔ مسئلہ یہ ہے کہ دنیا اب اسے بہت اچھی طرح سمجھنے لگی ہے۔

وجیہہ حسّان واحدی

عطیہ فیضی: عروج کی محفلوں سے زوال کی تنہائی تک

ایک نامور خاتون جنھیں ہم نے بھلا دیا!

کچھ زندگیاں کتاب کی طرح نہیں ہوتیں، ناول کی طرح ہوتی ہیں۔

ان میں آغاز بھی ہوتا ہے، کردار بھی، روشنی بھی، محفلیں بھی، عشق و عقل کی بحثیں بھی، سفر بھی، شہرت بھی، الزام بھی، اور آخر میں ایک ایسی خاموشی بھی، جو آدمی کے اندر دیر تک گونجتی رہتی ہے۔

عطیہ فیضی کی زندگی بھی ایسی ہی زندگی تھی۔

وہ ایک عورت نہیں تھیں، ایک عہد تھیں۔ ایک ایسا عہد جس میں برصغیر کی مسلمان عورت پہلی بار گھر کی چار دیواری سے نکل کر علم، ادب، موسیقی، مصوری، سیاست، فلسفے اور عالمی تہذیب کی محفلوں میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ صرف پڑھی لکھی خاتون نہیں تھیں، وہ اپنے زمانے کی تہذیبی علامت تھیں۔ ان کے ارد گرد شبلی نعمانی بھی تھے، علامہ اقبال بھی، گاندھی اور جناح بھی، سروجنی نائیڈو بھی تھیں، ٹاٹا خاندان بھی، ریاستوں کے راجے مہاراجے اور یورپ و ہندوستان کی علمی و ادبی دنیا بھی۔

لیکن یہ کہانی صرف شہرت کی نہیں ہے۔ یہ کہانی عروج سے زوال تک کا سفر ہے۔

ذرا تصور کیجیے۔ بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ بمبئی کے ایک پر شکوہ بنگلے کے ڈرائنگ روم میں ایک نوجوان خاتون بیٹھی ہے، روایتی معنوں میں بے پردہ، انگریزی اور فارسی میں رواں گفتگو کرتی ہوئی، اور اس کے سامنے دو ایسے لوگ بیٹھے

ہیں جن کے نام آج پاکستان اور ہندوستان کے ہر بچے کی زبان پر ہیں — مولانا شبلی نعمانی اور علامہ محمد اقبال۔ یہ خاتون نہ کسی کی بیوی کے طور پر یہاں ہے، نہ کسی کی بیٹی کے طور پر۔ یہ یہاں ہے کیونکہ یہ خود ایک عالمہ ہے، ایک ادیبہ ہے، اور اپنے دور کے سب سے بڑے ذہنوں کے ساتھ برابری کی سطح پر بحث کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس خاتون کا نام عطیہ فیضی تھا۔

Atiya Begum and Dr Fyzee Rahamin

عطیہ فیضی نے 1877 میں ہندوستان کے ایک عرب نژاد خاندان میں آنکھ کھولی۔ (فوٹو: وکی وینڈ)

اور افسوس کی بات یہ ہے کہ آج، سو سال بعد، ہم میں سے بیشتر لوگ اسے صرف ایک جملے میں یاد کرتے ہیں: "وہ خاتون جس سے اقبال کو محبت تھی۔" گویا اس کی پوری زندگی، اس کی علمیت، اس کی جدوجہد، اور اس کی شخصیت — سب کچھ ایک مرد کے حوالے سے سمٹ کر رہ گیا ہو۔ یہ مضمون اسی ناانصافی کو دور کرنے کی ایک کوشش ہے۔ آیئے عطیہ فیضی کو اس کی اپنی شناخت کے ساتھ جانیں۔

ایک غیر معمولی آغاز

عطیہ یکم اگست 1877 کو استنبول میں پیدا ہوئیں۔ یہ بذاتِ خود ایک دلچسپ بات ہے — ایک ہندوستانی مسلمان خاتون

کا ترکی کے دارالحکومت میں جنم لینا۔ ان کے والد حسن علی فیضی ایک کامیاب تاجر تھے جو سلطنتِ عثمانیہ کے دربار سے قریبی تعلقات رکھتے تھے، اور بمبئی کے مشہور طیب جی خاندان سے ان کا رشتہ تھا۔ طیب جی خاندان اپنے وقت کا ایک ایسا خاندان تھا جس نے ہندوستان کو وکیل، جج، سیاستدان اور مصلح دیے — اور جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، یہی خاندانی پس منظر عطیہ کی زندگی کے ایک نہایت دلچسپ پہلو کی بنیاد بنا۔

عطیہ کا بچپن بمبئی میں گزرا، ایک ایسے گھرانے میں جہاں روایت اور جدیدیت ایک ساتھ سانس لیتی تھیں۔ ان کی دو بہنیں، زہرہ اور نازلی، بھی علم و ادب سے گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ نازلی بعد میں جنجیرہ کی نواب بنیں۔ یہ تینوں بہنیں مل کر اپنے دور کی مسلم اشرافیہ میں علم کی روشنی پھیلانے کا ذریعہ بنیں۔

لیکن عطیہ نے جو قدم اٹھایا، وہ اپنے دور کی نوجوان مسلمان خواتین کے لیے تقریباً ناقابلِ تصور تھا۔ وہ پہلی مسلمان خاتون تھیں جنھوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ سوچیے، بیسویں صدی کے آغاز میں، جب برصغیر کی بیشتر مسلمان خواتین کا گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، عطیہ سمندر پار کر کے انگلستان گئیں، تعلیم حاصل کی، اور بے پردہ عوامی مقامات پر آنا جانا شروع کیا۔ انہوں نے 1906 سے 1907 کے دوران لندن کے ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج میں تعلیم حاصل کی، اور اسی دوران اپنی ایک سفری ڈائری بھی لکھی جو بعد میں "زمانہ تحصیل" کے نام سے شائع ہوئی۔

یہی نہیں — عطیہ نے کم عمری ہی میں اردو کے اصلاحی رسالوں میں لکھنا شروع کر دیا تھا، جن میں لاہور کا "تہذیب نسواں" اور علی گڑھ کا "خاتون" شامل تھے۔ یہ وہ رسالے تھے جو مسلمان خواتین کی تعلیم اور بیداری کے لیے کام کر رہے تھے، اور ایک نوجوان لڑکی کا ان میں قلم اٹھانا اپنے آپ میں ایک کارنامہ تھا۔

وہ دور جب علم زندہ تھا

عطیہ فیضی کی خوش قسمتی یہ تھی — یا شاید یہ ان کی اپنی محنت اور ذہانت کا نتیجہ تھا — کہ وہ اس دور میں جوان ہوئیں جب اردو اور فارسی ادب اپنے عروج پر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سر سید احمد خان کی تحریک نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی روح پھونک دی تھی، جب علی گڑھ تحریک اپنے جوبن پر تھی، اور جب ہندوستان کے گوشے گوشے سے ایسے ذہین لوگ ابھر رہے تھے جنھوں نے آنے والی نسلوں کی فکر کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔

اسی ماحول میں عطیہ کی ملاقات مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی۔ شبلی نعمانی، جو اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم، مؤرخ

اور نقاد تصور کیے جاتے تھے، عطیہ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ مگر اس فرق کے باوجود دونوں کے درمیان ایک گہرا علمی رشتہ قائم ہوا۔ شبلی نے عطیہ کو خطوط لکھے جن میں علم، ادب، تاریخ اور خواتین کی تعلیم پر تفصیلی گفتگو کی۔ یہ خطوط بعد میں "خطوطِ شبلی بنام زہرہ بیگم فیضی و عطیہ بیگم فیضی" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

اس خط کتابت کو کئی نقادوں نے محض ایک رومانوی تعلق سمجھ کر پیش کیا، مگر حقیقت میں یہ خطوط اس بات کا ثبوت ہیں کہ شبلی نعمانی عطیہ کو ایک سنجیدہ ذہن کے طور پر دیکھتے تھے—ایسی شاگردہ کے طور پر جسے وہ علم کی گہرائیوں میں لے جانا چاہتے تھے۔ خواتین کی تعلیم پر شبلی کا نقطہ نظر، اور ان کے دور میں عورت کی فکری حیثیت کے بارے میں ان کے خیالات، انہی خطوط میں محفوظ ہیں۔ یوں عطیہ ایک ایسی شاگردہ بن گئیں جس نے اپنے دور کے سب سے بڑے عالم کی فکری رفاقت حاصل کی۔

وہ ملاقات جس نے تاریخ بدل دی

لیکن عطیہ فیضی کی زندگی کا سب سے زیادہ زیرِ بحث باب وہ ہے جو 1907 میں شروع ہوا، جب ان کی ملاقات ایک نوجوان شاعر اور فلسفی سے ہوئی جو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ آیا تھا—محمد اقبال، جو بعد میں علامہ اقبال کہلائے۔

اقبال 1905 میں کیمبرج میں فلسفہ اور لندن کے 'لنکنز اِن' میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ پہنچے تھے۔ اقبال نے عطیہ کا سفرنامہ پڑھ رکھا تھا، اور اسی وجہ سے ان سے ملنے گئے۔ کیمبرج کی برفیلی سردیوں اور پھر ہائیڈلبرگ کی فضاؤں میں، دونوں نے ساتھ چہل قدمی کی، گھنٹوں باتیں کیں، اور ایک ایسی فکری ہم آہنگی پیدا ہوئی جو اقبال نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ تعلق محض جذباتی نہیں تھا—یہ دو ذہین لوگوں کی ملاقات تھی جو ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھتے اور ان سے متاثر ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عطیہ نے اقبال کو فارسی میں شاعری کرنے کی ترغیب دی، اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ علامہ اقبال کی فارسی شاعری—جو ان کے فلسفیانہ افکار کا سب سے گہرا اظہار سمجھی جاتی ہے—اگر اس ترغیب کا نتیجہ تھی، تو عطیہ کا کردار اردو اور فارسی ادب کی تاریخ میں کہیں زیادہ اہم ہے جتنا عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

اقبال 1908 میں ہندوستان واپس آئے، اور یہیں سے ان کی زندگی کا ایک تکلیف دہ باب شروع ہوتا ہے۔ ان کی شادی، جو خاندان نے ان کی رضامندی کے بغیر طے کی تھی، ان کے لیے ایک بوجھ بن چکی تھی۔ اقبال نے عطیہ کو

ایک خط میں اپنے دل کی بات کھول کر رکھ دی —انہوں نے لکھا کہ انہوں نے اپنے والد کو خط لکھ کر بتا دیا تھا کہ والد کو ان کی شادی طے کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، خاص طور پر جب انہوں نے اس قسم کے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی بیوی کی کفالت کرنے کو تیار ہیں، مگر اسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی اجیرن کرنے کے لیے تیار نہیں۔

1907 میں عطیہ فیضی نے اقبال کی دعوت پر کیمبرج کا دورہ کیا۔(فوٹو: ہیریٹیج پاکستان)

یہ ایک نہایت ذاتی، نہایت انسانی اعتراف تھا—ایک ایسے شاعر کی طرف سے جسے ہم آج محض ایک علامتی، تقریباً مقدس شخصیت کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ عطیہ کے سامنے اقبال نے اپنے دل کا وہ پہلو ظاہر کیا جو شاید کسی اور کے سامنے کبھی ظاہر نہ ہوا ہو۔ اور عطیہ نے اس اعتماد کا جواب نہایت تحمل اور دانائی سے دیا—انہوں نے اقبال کو اپنے دوستوں کی صحبت میں سکون تلاش کرنے کا مشورہ دیا۔

دونوں کبھی ازدواجی رشتے میں نہیں بندھے۔ اقبال نے 1910 میں سردار بیگم اور 1914 میں مختار بیگم سے شادی کی۔ ادھر عطیہ نے 1912 میں مشہور مصور سیموئیل فیضی رحمین سے شادی کر لی۔ شادیوں کے بعد دونوں کا رابطہ کم ہو گیا۔

عطیہ نے ان کی زندگی پر ایک کتاب لکھی جس کا عنوان محض "اقبال" تھا۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک نہایت دور

اندیش مشاہدہ پیش کیا کہ ہندوستانی معاشرے میں فرد کو اپنے خاندان کی خواہشات اور احکامات کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، اور اسی وجہ سے بے شمار غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل مرد و عورت اپنی زندگیاں برباد کر بیٹھے۔ انہوں نے اقبال کی زندگی کو ایک "ظالمانہ المیہ" قرار دیا، جس کے نشیب و فراز ان کے خاندان کی ضد کا نتیجہ تھے۔

عطیہ نے اپنے ملک سے، جو اقبال کے تصور کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا، یہ اپیل کی کہ اس خطرے سے ہوشیار رہا جائے، اور نوجوانوں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے سے پہلے یہ سوچا جائے کہ کسی قوم کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے افراد کی تکمیل کی گنجائش نہ ہو۔

یہ الفاظ آج بھی اتنے ہی معنی خیز ہیں جتنے اس وقت تھے۔

ایک دلچسپ، قدرے مزاحیہ پہلو

تاریخ کے سنجیدہ اوراق میں کبھی کبھار ایسے واقعات بھی چھپے ہوتے ہیں جو ہمیں مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ عطیہ فیضی کی زندگی میں ایک ایسا ہی دلچسپ پہلو ان کی شادی سے جڑا ہے۔ ان کے شوہر، سیموئیل فیضی رحمین، اصل میں ایک یہودی نژاد برطانوی مصور تھے، اور برطانوی شاہی خاندان سے بھی ان کا تعلق تھا—وہ کنگ جارج پنجم کی اہلیہ، ملکہ مریم، کے فنِ مصوری کے استاد رہ چکے تھے۔ عطیہ کے اصرار پر سیموئیل نے اسلام قبول کیا اور اپنا نام بدل کر فیضی رحمین رکھا۔

ذرا تصور کیجیے اس زمانے کی بمبئی کی اشرافیہ کی محفلوں میں اس خبر کا کیا چرچا ہوا ہوگا—ایک یہودی النسل برطانوی مصور، جو ملکہ کا استاد رہ چکا تھا، ایک بمبئی کی مسلمان خاتون کے عشق میں اسلام قبول کر کے اس کا شوہر بن گیا۔ یہ کہانی خود ایک ناول کا موضوع بن سکتی تھی۔

دونوں نے مل کر بمبئی میں ایک ایسا گھر بنایا جو خود ایک ادارہ بن گیا—"ایوانِ رفعت"۔ یہاں ادیب، فنکار، موسیقار اور دانشور جمع ہوتے، اور یہ گھر اپنے دور کی ثقافتی زندگی کا مرکز بن گیا۔ عطیہ اور سیموئیل نے مل کر ہندوستانی موسیقی پر انگریزی زبان میں ایک مستند کتاب بھی لکھی جو تین ایڈیشنز میں شائع ہوئی:

Sangit of India اور، Indian Music، The Music of India

ان کتابوں میں عطیہ کی رنگین اور تاثراتی نثر نے سیموئیل کی بنائی ہوئی موسیقی کی مصوری (راگ مالا) کی تشریح کی۔

عطیہ نے اپنے شوہر کے دو اور ڈراموں

"Daughter of Ind" اور "Invented Gods"

کے لیے موسیقی اور رقص کی ترتیب بھی دی، جو 1930 کی دہائی میں لندن میں اسٹیج ہوئے۔ یہ صرف ایک شادی نہیں تھی — یہ دو فنکارانہ ذہنوں کی ایک ایسی شراکت داری تھی جس کی مثال اپنے دور میں شاذونادر ہی ملتی تھی۔

طیب جی خاندان اور گاندھی جی سے رشتہ

عطیہ فیضی کا تعلق بمبئی کے مشہور طیب جی خاندان سے تھا، اور یہ خاندانی پس منظر ان کی زندگی کا ایک نہایت اہم اور اکثر نظر انداز کیا جانے والا پہلو ہے۔ طیب جی خاندان ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں گہرائی سے شامل تھا۔ بدرالدین طیب جی، جو خاندان کے سب سے نمایاں رکن تھے، انڈین نیشنل کانگریس کے ابتدائی صدور میں شامل تھے۔ جب گاندھی جی جنوبی افریقہ سے واپس ہندوستان آئے تو بدرالدین طیب جی نے ان کا استقبال کیا، گاندھی جی پورے طیب جی خاندان سے گہری محبت رکھتے تھے۔

عطیہ کے قریبی رشتہ دار، عباس طیب جی، گاندھی جی کے قریب ترین ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ بڑودہ ریاست کے چیف جسٹس رہ چکے تھے، مگر 1919 میں اپنی پر تعیش زندگی کو خیرباد کہہ کر آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ گاندھی جی کی قیادت میں عباس طیب جی نے گجرات میں قومی تحریک کے کئی تجربات کامیابی سے انجام دیے۔ اسی لیے گاندھی جی نے انہیں "گجرات کا ہی را" کا خطاب دیا۔ عباس طیب جی نے 'باردولی ستیہ گرہ' کی کامیاب قیادت کی، اور جب گاندھی جی کو ڈانڈی مارچ کے دوران گرفتار کیا گیا تو انہوں نے ہی تحریک کی کمان سنبھالی۔

بمبئی سے کراچی: ایک نئی زندگی کا آغاز

عطیہ کی بہن نازلی، جنجیرہ کی نواب، بھی گاندھی جی کے افکار سے متاثر ہوئیں اور کانگریس کے لیے چندہ جمع کیا۔ یوں عطیہ کا خاندانی حلقہ ایک ایسا حلقہ تھا جس کی ڈوریں براہ راست گاندھی جی اور آزادی کی تحریک سے جڑی ہوئی تھیں — ایک ایسا تعلق جو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ عطیہ کس قدر وسیع اور بااثر سماجی و سیاسی دائرے میں سانس لے رہی تھیں۔

قائداعظم محمد علی جناح سے عطیہ کا تعلق اس سے بھی زیادہ ذاتی اور براہ راست تھا۔ عطیہ قائداعظم کے قریبی حلقے کا حصہ تھیں، اور تقسیمِ ہند کے بعد جناح نے انہیں پاکستان میں ایک پرشکوہ رہائش گاہ الاٹ کی۔ یہ قائداعظم کی ہی دعوت پر تھا کہ عطیہ، ان کے شوہر اور بہن نازلی 1948 میں کراچی منتقل ہوئے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بانیِ پاکستان عطیہ کی علمی و ثقافتی حیثیت کو کس قدر اہمیت دیتے تھے کہ انہوں نے خود اس خاندان کو نئے ملک میں آباد ہونے کی دعوت دی۔

یہ ایک ایسی کوشش تھی کہ پرانی دنیا کا ایک ٹکڑا نئی سرزمین پر دوبارہ زندہ کیا جا سکے۔ کراچی میں عطیہ نے برنس گارڈن میں ایک آرٹ انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کی بھی کوشش کی، مگر حکومتی غفلت کی وجہ سے یہ منصوبہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود، عطیہ کا گھر کئی برسوں تک کراچی کی ثقافتی زندگی کا ایک اہم مرکز رہا۔

ایوان رفعت کی بحالی کا آغاز نوے کی دہائی کے شروع میں ہوا۔(فوٹو: ایکسپریس ٹریبیون)

شہرت سے مفلسی تک: ایک دردناک سفر

یہاں سے عطیہ فیضی کی کہانی کا وہ باب شروع ہوتا ہے جو سب سے زیادہ دل دہلا دینے والا اور سب سے زیادہ سبق آموز ہے۔

قائداعظم کے انتقال کے بعد، عطیہ اور سیموئیل کو وہ گھر خالی کرنا پڑا جو جناح نے انہیں الاٹ کیا تھا۔ ساتھ ہی ان پر مالی مشکلات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا، اور انہیں بیرونِ ملک رہنے والے رشتہ داروں کی مالی امداد پر گزارہ کرنا پڑا۔

یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک ایسی خاتون جو کبھی بمبئی کی سب سے بڑی محفلوں کی میزبان تھیں، جس کے گھر میں شبلی نعمانی اور اقبال جیسے لوگ بیٹھتے تھے، جسے قائداعظم نے خود اپنے نئے ملک میں خوش آمدید کہا تھا—وہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں شدید مالی مشکلات کا شکار ہو گئیں؟

اس کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ عطیہ اور سیموئیل کی پوری زندگی کا انحصار ان کی ذاتی دولت، فنی اثاثوں، اور سرپرستی پر تھا—کوئی مستقل، خود کفیل ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ جب تقسیم کے بعد ان کی بیشتر جائیداد اور مالی وسائل بمبئی میں رہ گئے یا ضائع ہو گئے، اور جب جناح کی وفات کے بعد ان کا الاٹ شدہ گھر بھی واپس لے لیا گیا، تو ان کے پاس آمدنی کا کوئی مستحکم ذریعہ باقی نہ رہا۔

ایک گواہی کے مطابق، وہ زیادہ دیر تک کسی پانچ ستارہ ہوٹل میں رہائش کا خرچ برداشت نہ کر سکے، اور جلد ہی انہیں اپنی قیمتی فرنیچر اور فنی اشیاء کو کوڑیوں کے بھاؤ کباڑیوں کے ہاتھ بیچنا پڑا، اور قرض لے کر کراچی میں زندگی گزارنی پڑی—اسی شہر میں جہاں انہیں خود ملک کے بانی نے دعوت دی تھی۔

سیموئیل کا انتقال 1964 میں ہوا، اور عطیہ نے اپنی زندگی کے آخری تین برس مزید تنہائی اور مفلسی میں گزارے۔ وہ 4 جنوری 1967 کو کراچی میں انتقال کر گئیں—اس حالت میں کہ جس شان و شوکت کے ساتھ انہوں نے اپنی جوانی گزاری تھی، اس کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا گھر، جو فن اور ادب کا خزانہ تھا، عوام کے لیے کھول دیا گیا تاکہ لوگ ان کا فنی ذخیرہ دیکھ سکیں۔ یہ سلسلہ 1990 کی دہائی تک جاری رہا، جس کے بعد یہ مجموعہ بکھر گیا۔

یہ کہانی محض ایک افسوسناک انجام نہیں ہے—یہ ہمیں ایک گہرا سبق دیتی ہے۔

عطیہ فیضی کی زندگی سے ہم کیا سیکھ سکتے ہیں؟

عطیہ فیضی کی زندگی ہمیں کئی گہرے اسباق دیتی ہے، جو آج کے دور میں بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے ان کے اپنے وقت میں تھے۔

سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ علم اور ہمت کسی صنف کی محتاج نہیں ہوتی۔ عطیہ نے ایک ایسے دور میں، جب خواتین کے لیے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنا بھی مشکل تھا، اپنی محنت اور ذہانت سے اپنے دور کے سب سے بڑے دانشوروں میں اپنی جگہ بنائی۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی ناموافق ہوں، عزم اور علم کی پیاس انسان کو آگے بڑھا سکتی ہے۔

دوسرا سبق مالی استحکام کی اہمیت سے متعلق ہے۔ عطیہ کی زندگی کا سب سے دردناک باب—شہرت سے مفلسی تک کا سفر—ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ شان و شوکت، تعلقات اور سرپرستی کبھی بھی خود کفیل، مستقل مالی منصوبہ بندی کا متبادل

نہیں ہو سکتے۔ زندگی کے حالات اچانک بدل سکتے ہیں — جیسا کہ تقسیم نے لاکھوں لوگوں کے ساتھ کیا — اور ایسے میں صرف وہی استحکام باقی رہتا ہے جو ہم نے اپنے ہاتھوں سے، اپنی محنت اور دور اندیشی سے، بنایا ہو۔

تیسرا سبق وقار سے متعلق ہے۔ مفلسی کے باوجود، عطیہ نے اپنی فکری اور تخلیقی زندگی کو کبھی ترک نہیں کیا۔ ان کا گھر، حتیٰ کہ مشکل ترین حالات میں بھی، علم و فن کا ایک مرکز رہا۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کی اصل دولت اس کا ذہن اور اس کا کردار ہے، نہ کہ اس کے پاس موجود مادی وسائل۔

چوتھا سبق یہ ہے کہ تاریخ اکثر عورتوں کے کارناموں کو مردوں کے سائے میں دفن کر دیتی ہے۔ عطیہ کو صدیوں تک محض "اقبال کی محبوبہ" کے طور پر یاد کیا گیا، جبکہ ان کی اپنی علمی خدمات، ان کی تصانیف، اور ان کا اپنا کردار پسِ منظر میں چلا گیا۔ یہ ہمیں یہ ذمہ داری سونپتا ہے کہ ہم تاریخ کی ان غیر منصفانہ تصویروں کو درست کریں اور خواتین کے کارناموں کو ان کی اپنی شناخت کے ساتھ یاد کریں۔

عطیہ فیضی کو جاننا کیوں ضروری ہے؟

آج، جب ہم اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو رول ماڈلز تلاش کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، تو ہمیں اپنی ہی تاریخ میں ان گنت ایسی شخصیات ملتی ہیں جنہیں ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ عطیہ فیضی ان میں سے ایک ہیں — ایک ایسی خاتون جو علم کی طلب میں سمندر پار گئیں، جس نے اپنے دور کے سب سے بڑے ادیبوں اور مفکروں کے ساتھ برابری کی سطح پر مکالمہ کیا، جس نے اپنے قلم سے تاریخ میں اپنا نام درج کیا، اور جس نے انتہائی مشکل حالات میں بھی اپنا وقار برقرار رکھا۔

عطیہ کی کہانی محض ایک نوسٹیلجیا نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم اپنے معاشرے کی ان کمزوریوں کو دیکھ سکتے ہیں جو آج بھی موجود ہیں — خواتین کی کامیابیوں کو ان کے اپنے حق میں تسلیم کرنے میں ہماری ہچکچاہٹ، اور مادی شان و شوکت کی عارضی نوعیت۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک ایسی روشنی بھی ہے جو ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ علم، ہمت اور وقار ایسی دولت ہیں جنہیں کوئی تقسیم، کوئی مفلسی، اور کوئی نظر انداز کرنے والی تاریخ بھی مکمل طور پر مٹا نہیں سکتی۔

عطیہ فیضی کا انتقال 1967 میں ہوا، مگر ان کے خطوط، ان کی کتابیں، اور ان کی زندگی کا قصہ آج بھی ہمیں بتاتا ہے کہ ایک عورت کتنی بلندیوں کو چھو سکتی ہے — اگر اسے موقع ملے، اور اگر اس کی ہمت کبھی ماند نہ پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ عطیہ فیضی کو جاننا، یاد رکھنا، اور آنے والی نسلوں تک ان کا تذکرہ پہنچانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

دین اور دنیا

کوکب شہزاد

توازن کیسے ہو؟

[ستمبر ۲۰۲۴ء کو آسٹریلیا "المورد" نے مجھے اور ڈاکٹر شہزاد سلیم کو آسٹریلیا مدعو کیا تا کہ ہم وہاں کے لوگوں کے ساتھ بیٹھیں اور ان کو اور ان کے بچوں کو جدید دور میں جن مسائل کا سامنا ہے، ان میں ان کی رہنمائی کریں اور ان کے سوالوں کا تشفی بخش جواب دیں۔ عام طور پر ہم دونوں کے سیشن اکٹھے ہوتے تھے اور کچھ سیشن الگ الگ ہوتے تھے۔ شہزاد مردوں اور بچوں کے ساتھ ہوتے تھے اور ان کے سوالوں کے جواب دیتے تھے اور نوجوان بچوں کو پیش آنے والے مسائل کا حل بتاتے تھے، جب کہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں خواتین کے ذاتی مسائل کے بارے میں سوالوں کے جواب دیتی تھی۔]

افسوس ہے کہ جتنا ہم آج کل جدید دور کے تقاضوں کے تحت سائنسی اور جدید تعلیمات کے بارے میں حساس ہیں ،اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ادھار اٹھا کر باہر کی نامور یونیورسٹیوں میں بھیجتے ہیں تا کہ ہمارے بچے کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں اتنا ہی ہم اپنی مذہبی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ ان کے سوالوں سے پتا چلتا ہے کہ انھیں تو اسلام کی الف ب کا بھی پتا نہیں۔ ان کا اسلام کے بارے میں علم صرف سنی سنائی کہانیوں پر مبنی ہے، اس لیے مذہب کے بارے میں کنفیوز ہیں اور ان کے تصورات واضح نہیں ہیں۔ ایک دن ملبورن میں ہونے والی ایک نشست میں ایک پڑھی لکھی خاتون نے مجھ سے سوال کیا کہ ہمیں کیک نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کبھی کیک نہیں کھایا تھا۔ میں اس خاتون کی یہ بات سن کر حیران و پریشان رہ گئی۔ میں نے بلا تاخیر پوچھا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی جہاز میں سفر نہیں کیا تھا تو پھر آپ جہاز میں سفر کیوں کرتی ہیں؟ میرا یہ سوال سن کر وہ خاتون سٹپٹا گئی اور کہنے لگی کہ آپ میرا مذاق اڑا لیں۔ میں نے اس کو یہ سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہمیں اللہ تعالیٰ کا دین

سمجھانے آتے ہیں کہ ہم کس طرح اللہ کے فرماں بردار بن سکتے ہیں اور ہم کس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور کن کاموں سے ہمیں گناہ ملتا ہے اور کن کاموں کے کرنے سے ہم دوزخ میں جاسکتے ہیں۔ کیک بنانے میں جو اجزا استعمال ہوتے ہیں، اس میں میدہ، انڈے، چینی، مکھن اور بیکنگ پاؤڈر ہیں اور ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز حرام نہیں ہے۔

دنیا کے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل دی ہے اور ان کو ہم بہت بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ دنیا میں جب انسان آیا تو اس وقت وہ اپنی زندگی کے آغاز میں غاروں میں رہتا تھا اور جانوروں کا شکار کر کے وہ اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی عقل کا استعمال کر کے ترقی کی منازل طے کرتے کرتے انسان یہاں تک آ پہنچا ہے کہ اب لیبارٹریوں میں بچے پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چاند اور ستاروں پر اپنی کمند ڈال رہا ہے۔ مہینوں پہلے شمسی اور قمری کیلنڈر بنا رہا ہے۔ بارشوں اور آندھی طوفان کے آنے کی پیش گوئی کر رہا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ آج سے چودہ سو سال پہلے ممکن نہیں تھا اور اگر ہم اس طرح سوچنے لگیں گے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا، جس طرح ہوتا تھا، ہم بھی ویسے ہی وہ کام کریں گے اور جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھا، وہ ہم نہیں کریں گے تو ہم اپنے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کر لیں گے۔ دنیا کی ترقی سے کبھی استفادہ نہیں کر پائیں گے۔ یہ ایئر کنڈیشنر، یہ ٹی وی، گاڑی، جہاز اور واشنگ مشین اور دوسری بے تحاشا چیزیں جو ہمیں سائنس کی ترقی سے ملی ہیں، ہم استفادہ نہیں کر پائیں گے اور پھر ہمیں دوبارہ غاروں کی دنیا میں واپس چلے جانا چاہیے۔ دین کے معاملات میں ہماری عقل ٹھوکر کھا سکتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی رہبری کی ضرورت پڑتی ہے، جس کو بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے نبی آتے رہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دین مکمل کر دیا اور قرآن مجید کی شکل میں قیامت تک کے لیے ہماری ہدایت کا سرچشمہ مکمل کر دیا، جو قیامت تک ہدایت کے لیے کافی ہے، جب کہ دنیا میں ترقی کے لیے ہماری عقل ہماری بہترین رہنمائی کرتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی جگہ سے گزر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ کچھ لوگ درخت کی پیوند کاری کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اگر تم یہ پیوند کاری نہ کرو گے تو کیا ہو گا؟ لوگ خاموش رہے اور پیوند کاری نہ کی، چنانچہ وہ فصل اچھی نہ ہوئی۔ وہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہم نے آپ کے کہنے پر پیوند کاری نہیں کی تھی تو ہماری فصل اچھی نہیں ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو میں تمھیں دین سکھانے آیا ہوں، مجھ سے دین سیکھا کرو۔ دنیا کے معاملات میں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دین اور دنیا

سمجھانے آتے ہیں کہ ہم کس طرح اللہ کے فرماں بردار بن سکتے ہیں اور ہم کس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور کن کاموں سے ہمیں گناہ ملتا ہے اور کن کاموں کے کرنے سے ہم دوزخ میں جاسکتے ہیں۔ کیک بنانے میں جو اجزا استعمال ہوتے ہیں، اس میں میدہ، انڈے، چینی، مکھن اور بیکنگ پاؤڈر ہیں اور ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز حرام نہیں ہے۔

دنیا کے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل دی ہے اور ان کو ہم بہت بہتر طریقے سے کرسکتے ہیں۔ دنیا میں جب انسان آیا تو اس وقت وہ اپنی زندگی کے آغاز میں غاروں میں رہتا تھا اور جانوروں کا شکار کرکے وہ اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی عقل کا استعمال کرکے ترقی کی منازل طے کرتے کرتے انسان یہاں تک آپہنچا ہے کہ اب لیبارٹریوں میں بچے پیدا کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ چاند اور ستاروں پر اپنی کمند ڈال رہا ہے۔ مہینوں پہلے شمسی اور قمری کیلنڈر بنا رہا ہے۔ بارشوں اور آندھی طوفان کے آنے کی پیش گوئی کررہا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ آج سے چودہ سو سال پہلے ممکن نہیں تھا اور اگر ہم اس طرح سوچنے لگیں گے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا، جس طرح ہوتا تھا، ہم بھی ویسے ہی وہ کام کریں گے اور جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھا، وہ ہم نہیں کریں گے تو ہم اپنے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کرلیں گے۔ دنیا کی ترقی سے کبھی استفادہ نہیں کرپائیں گے۔ یہ ایئر کنڈیشنر، یہ ٹی وی، گاڑی، جہاز اور واشنگ مشین اور دوسری بے تحاشا چیزیں جو ہمیں سائنس کی ترقی سے ملی ہیں، ہم استفادہ نہیں کر پائیں گے اور پھر ہمیں دوبارہ غاروں کی دنیا میں واپس چلے جانا چاہیے۔ دین کے معاملات میں ہماری عقل ٹھوکر کھاسکتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی رہبری کی ضرورت پڑتی ہے، جس کو بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے نبی آتے رہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دین مکمل کردیا اور قرآن مجید کی شکل میں قیامت تک کے لیے ہماری ہدایت کا سرچشمہ مکمل کردیا، جو قیامت تک ہدایت کے لیے کافی ہے، جب کہ دنیا میں ترقی کے لیے ہماری عقل ہماری بہترین رہنمائی کرتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی جگہ سے گزر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ کچھ لوگ درخت کی پیوند کاری کررہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اگر تم یہ پیوند کاری نہ کروگے تو کیا ہوگا؟ لوگ خاموش رہے اور پیوند کاری نہ کی، چنانچہ وہ فصل اچھی نہ ہوئی۔ وہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہم نے آپ کے کہنے پر پیوند کاری نہیں کی تھی تو ہماری فصل اچھی نہیں ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو میں تمھیں دین سکھانے آیا ہوں، مجھ سے دین سیکھا کرو۔ دنیا کے معاملات میں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں بھی ایک انسان ہی ہوں، جب میں تمھارے دین کے متعلق تمھیں کوئی حکم دوں تو اُسے لے لو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میری حیثیت بھی اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ میں ایک انسان ہوں... میں نے اندازے سے ایک بات کہی تھی۔ اِس لیے تم اِس طرح کی باتوں پر مجھے جواب دہ نہ ٹھیراؤ جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ ہاں، جب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھیں کچھ کہوں تو اُسے لے لو، اِس لیے کہ میں اللہ پر کبھی جھوٹ نہ باندھوں گا... تم اپنے دنیوی معاملات کو بہتر جانتے ہو۔"
(مسلم، رقم ٦١٢٦-٦١٢٨)

اگر ہم دین کو دیکھیں تو اس میں بنیادی طور پر دو ہی چیزیں ہوتی ہیں: ١۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق۔ ٢۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق۔ ان تمام حقوق کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں اس طرح ہے:

"(سنو)، تم اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بناؤ کہ (روز قیامت) ملامت زدہ اور بے یارومددگار بیٹھے رہ جاؤ۔ تمھارے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ تنہا اُسی کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں اگر تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ اُن کو اف کہو اور نہ اُن کو جھڑک کر جواب دو، تم اُن سے ادب کے ساتھ بات کرو اور اُن کے لیے نرمی سے عاجزی کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، اُن پر رحم فرما، جس طرح اُنھوں نے (رحمت و شفقت کے ساتھ) مجھے بچپن میں پالا تھا۔ (لوگو)، تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو پلٹ کر آنے والوں کے لیے وہ بڑا درگذر فرمانے والا ہے۔ تم قرابت دار کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور مال کو بے جا نہ اڑاؤ۔ اِس لیے کہ مال کو بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور اگر اِن (ضرورت مندوں) سے اعراض کرنا پڑے، اِس لیے کہ ابھی تم اپنے پروردگار کی رحمت کے انتظار میں ہو، جس کی تمھیں امید ہے، تو اِن سے نرمی کی بات کہو۔ اپنا ہاتھ

نہ گردن سے باندھے رکھو اور نہ اُس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔ بے شک، تمھارا پروردگار ہی جس کے لیے چاہتا ہے، رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے یقیناً باخبر ہے، وہ اُنھیں دیکھ رہا ہے۔ تم لوگ اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم اُنھیں بھی روزی دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔ اُن کا قتل یقیناً بہت بڑا جرم ہے۔ اور زنا کے قریب نہ جاؤ، اِس لیے کہ وہ کھلی بے حیائی اور بہت بری راہ ہے۔ خدا نے جس جان کی حرمت قائم کر دی ہے، اُسے ناحق قتل نہ کرو اور (یاد رکھو کہ) جو مظلومانہ قتل کیا جائے، اُس کے ولی کو ہم نے اختیار دے دیا ہے۔ سو وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے، اِس لیے کہ اُس کی مدد کی گئی ہے۔ تم یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو۔ ہاں، مگر اچھے طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کرو، اِس لیے کہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ تم پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی یہی اچھا طریقہ ہے۔ تم اُس چیز کے پیچھے نہ پڑو جسے تم جانتے نہیں ہو، اِس لیے کہ کان، آنکھ اور دل، اِن سب کی پرسش ہونی ہے۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، اِس لیے کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ اِن سب باتوں کی برائی تمھارے پروردگار کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔ یہ اُنھی حکمت کی باتوں میں سے ہیں جو تمھارے پروردگار نے تمھاری طرف وحی کی ہیں۔ (اِنھیں مضبوطی سے پکڑو) اور (ایک مرتبہ پھر سن لو کہ) اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ کہ راندہ اور ملامت زدہ ہو کر جہنم میں ڈال دیے جاؤ۔"

(۱۷:۲۲-۳۹)

ان حقوق کے تعین کے بارے چونکہ ہم مغالطے میں پڑ سکتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو واضح کر دیا اور دنیا کے معاملات کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا۔ عمارت بنانے کے لیے کیا کچھ چاہیے؟ فیکٹری کے لیے کون کون سی مشینیں چاہییں؟ سردی میں کیا پہننا ہے اور گرمی ہو تو کیا پہننا چاہیے وغیرہ۔ ان سب چیزوں کو طے کرنے کے لیے ہماری عقل

اور ہمارا تجربہ ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور دنیاوی معاملات کو حل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو کسی نہ کسی صلاحیت سے نوازا ہے۔ کچھ لوگ بہترین ڈاکٹر بن سکتے ہیں اور کچھ لوگ بہترین انجینئر بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کچھ بہترین استاد بن سکتے ہیں۔ ان معاملات کے لیے وحی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے، بس عقل اور تجربہ ہی کافی ہے۔

اسی گفتگو کے ضمن میں اس بات کو بھی زیر بحث لانا چاہتی ہوں کہ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم شدید سردی میں وضو کر کے جرابیں پہن لیں اور پھر باقی نمازوں میں ہم ان جرابوں پر مسح کر سکتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں کے کچھ اہل فکر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو چمڑے کی جرابیں پہنتے تھے، جب کہ ہمارے پاس پہننے کے لیے یا تو سوتی جرابیں ہوتی ہیں یا پھر نائیلون کی۔ لہٰذا ان جرابوں پر مسح نہیں ہو سکتا۔ یہ دلیل بالکل بودی دلیل ہے۔ اس کا عقل سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر اس زمانے میں کاٹن اور نائلون کی جرابیں ہوتیں تو یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ جرابیں پہنتے۔ اسلام ہمیں سائنس کی نئی دریافتوں اور ایجادات کو استعمال سے ہرگز نہیں روکتا، بلکہ ان کے استعمالات کی ترغیب دیتا ہے۔ اگر آج جدید دور میں کوئی نبی ہوتا تو یقیناً وہ اس دور کی ترقی سے ضرور استفادہ کرتا۔ دین کے بارے میں یہ رویہ خود کو مشکلات میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ہمارے لیے دین کو بہت آسان اور سہل بنایا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جتنی مشکل راہ کا انتخاب کریں گے، اتنا ہم دین سے قریب ہوں گے۔

ایک موقع پر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو (اپنے لیے دین میں مشکلات کا راستہ اختیار کر کے دین سے کشتی لڑے گا تو دین اسے پچھاڑ دے گا۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جب دین میں کسی چیز پر عمل کرنے کے دو راستے ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آسان راستے کو اختیار کرتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اس لیے کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے آسانیاں ہوں۔ اسی میں خیر و برکت ہو اور وہ ان مشکلات سے نکلیں جس میں بنی اسرائیل پڑے ہوئے تھے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے مشکلات نہیں (البقرہ ۲: ۱۸۵)۔ ہمارے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ جن معاملات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی واضح ہدایات موجود ہیں اس میں ہم خود اجتہاد کرنے کی کوشش نہ کریں۔

علامتی افسانہ

نعیم احمد بلوچ

آئینے کا شہر

ملینا کے لیے یہ بس ایک معمول کی تصویر تھی۔

دنیا بھر کے سربراہان ایک وسیع ہال میں جمع تھے۔ چھت سے لٹکتے عظیم فانوسوں کی روشنی سنگ مرمر کے فرش پر بکھر رہی تھی اور سامنے درجنوں کیمرے کسی شکاری پرندے کی طرح اپنی آنکھیں کھولے منتظر کھڑے تھے۔

ایسے اجتماعات میں گروپ فوٹو سیشن معمول کی بات تھی۔ لیکن آج ایک عجیب بات ہوئی۔

"ملینا! صرف ایک تصویر اور!"

آواز سن کر وہ چونکی۔ لارڈ ڈریکس مسکرا رہا تھا۔

وہی ڈریکس جو عام طور پر کسی کے پاس نہیں جاتا تھا بلکہ لوگوں کو اپنے پاس بلانے کا عادی تھا۔ وہی ڈریکس جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر کسی تصویر میں اس کا چہرہ درمیان میں نہ ہو تو تصویر دوبارہ کھنچوائی جاتی ہے۔

ملینا ایک لمحے کے لیے رکی۔ دل میں ایک ہلکی سی خلش ابھری۔

" کہیں ایسا تو نہیں لوگ سمجھیں کہ میں اس کی طاقت سے مرعوب ہوں؟"

اس نے ہال میں نظریں دوڑائیں۔۔۔ شمال جنوب مشرق مغرب۔۔۔ سب موجود تھے۔

"نہیں۔" اس نے خود سے کہا۔

"یہ کوئی دربار نہیں۔ یہ عالمی اجتماع ہے۔ یہاں کوئی بڑا اور چھوٹا نہیں۔ اور پھر میری ریاست بھی کسی سے کم باوقار نہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے ڈریکس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ فلیش چمکے۔ تصویر بن گئی۔ اور بات ختم ہو گئی۔ کم از کم ملینا یہی سمجھی تھی۔

تین دن بعد صبح سات بجے اس کے دفتر کا دروازہ زور سے کھلا۔

اس کا میڈیا سیکریٹری تقریباً دوڑتا ہوا اندر آیا۔ ملینا نے کافی کا کپ میز پر رکھا۔

"کیا ہوا؟"

"میڈم، شاید وہ اب محض تصویر نہیں رہی!"

سیکریٹری نے ٹیبلٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اسکرین پر ڈریکس ایک جلسے میں تقریر کر رہا تھا۔

"اور میں خوش ہوں کہ دنیا کے بڑے رہنما بھی اب ہماری قیادت پر اعتماد کر رہے ہیں۔ چند دن پہلے ملینا خود میرے ساتھ خصوصی ملاقات کی خواہش مند تھیں۔"

ہجوم تالیوں سے گونج اٹھا۔ ملینا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ویڈیو آگے بڑھی۔

"...وہ میری پالیسیوں کی تعریف کر رہی تھیں۔"

اب اسکرین پر وہی تصویر نمودار ہوئی جو کانفرنس کے بعد کھینچی گئی تھی۔ ملینا نے خاموشی سے ویڈیو بند کر دی۔ کمرے میں چند لمحے سکوت رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا:

"کیا میں نے ان سے تنہائی میں ملاقات کی تھی؟"

"نہیں۔"

"کیا میں نے ان کی کسی پالیسی کی حمایت کی تھی؟"

"ہر گز نہیں۔"

"تو پھر وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

سیکریٹری نے محتاط لہجے میں کہا،

"وہ طاقت ور آدمی ہیں، میڈم۔"

ملینا نے کرسی کی پشت سے ٹیک ہٹالی۔

"طاقت ور آدمی کو جھوٹ بولنے کا لائسنس نہیں مل جاتا۔"

اگلے دن دارالحکومت کے تاریخی چوک میں پریس کانفرنس ہوئی۔ دنیا بھر کے صحافی موجود تھے۔ ایک رپورٹر نے پہلا سوال کیا۔

"کیا آپ واقعی لارڈ ڈریکس کی حامی ہیں؟"

ملینا نے مائیک درست کیا۔

"نہیں۔"

ہجوم میں سرگوشیاں پھیل گئیں۔

"کیا آپ ان کی مخالف ہیں؟"

"نہیں۔"

اب صحافی مزید الجھ گئے۔

ملینا نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔

"دوستی اور تابع داری میں فرق ہوتا ہے۔"

وہ چند لمحوں کے بعد پھر بولی: "یہ ایک تصویر نہیں، ایک آئینہ ہے، اور آئینہ آپ کو آپ کی پسند کی تصویر نہیں دکھاتا۔ دنیا اس تصویر کو ہم دونوں کے فیصلوں سے سمجھے گی۔"

پورا چوک خاموش ہو گیا۔

"میں ہر ملک کے ساتھ احترام پر مبنی تعلقات رکھتی ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص ایک تصویر کو اپنی برتری کا ثبوت بنانے لگے تو مسئلہ تصویر میں نہیں، اس کی سوچ میں ہوتا ہے۔"

یہ جملہ چند منٹ میں پوری دنیا میں پھیل گیا۔

دوسری طرف ڈریکس اپنے محل میں غصے سے آگ بگولا تھا۔

"اس نے میری تردید کی ہے!"

اس نے میز پر مکہ مارا۔ مشیر خاموش کھڑے تھے۔ آخر ایک بوڑھا مشیر بولا:

"جناب، شاید بات یہیں ختم کر دینا بہتر ہو۔"

ڈریکس نے گھور کر دیکھا۔

"تم سمجھتے نہیں۔ اگر لوگ یہ مان لیں کہ کوئی میری بات رد کر سکتا ہے تو کل دوسروں کو بھی ہمت ہو جائے گی۔"

"لیکن جناب، دنیا بدل رہی ہے۔"

"دنیا نہیں بدلے گی۔"

ڈریکس غرایا۔

"دنیا وہی دیکھے گی جو میں دکھاؤں گا۔"

اس کے بعد مہینوں تک ڈریکس ہر تقریر میں اپنا ذکر کرتا رہا۔ وہ اپنے قصیدے لکھواتا، اپنے نام کے نعرے لگواتا، اپنے مخالفین کا مذاق اڑاتا۔ لیکن ایک عجیب بات ہونے لگی۔ جتنا وہ خود کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی لوگ سوال پوچھنے لگتے۔ اور سوال طاقت کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔

ایک شام محل کے ایک دور دراز گوشے میں وہ چاند ماری کے لیے پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور محافظ ساتھ چل رہے تھے۔ اس کے ہر اشارے کی تکمیل کرنے کے لیے۔ وہ ایک تالاب کے کنارے چل رہا تھا۔ دور اسے ایک کوے کی آواز سنائی دی۔ بہت بری آواز۔ اس نے ناپسندیدگی سے منہ بسورا۔ جس تلخی کو بھولنے نکلا تھا وہ مزید گہری ہو گئی۔ اس نے ناگواری سے قدم پٹخے اور اپنے محافظ سے پوچھا:

"لوگ میری باتوں پر پہلے جیسا یقین کیوں نہیں کرتے؟"

محافظ خاموش رہا جیسا پوچھ رہا ہو کہ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ اور ایسے پوچھا کہ جیسے حکم دے رہا ہو۔ محافظ نے قدم روک دیے۔

"حضور، کیا آپ واقعی جاننا چاہتے ہیں؟"

اس نے گھور کر دیکھا تو وہ بول اٹھا:

"کیونکہ آئینہ تعریف نہیں کرتا۔"

ڈریکس نے بھنویں سکیڑ لیں۔

"کیا مطلب؟"

محافظ نے سامنے تالاب کے پانی کی طرف اشارہ کیا۔

"آئینہ صرف دکھاتا ہے۔ اور جب آدمی اپنی تصویر کے بجائے اپنی خواہش دیکھنے لگے تو وہ آئینے سے لڑنے لگتا ہے۔"

ڈریکس کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔

پانی میں اس کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس میں کوئی لرزش نہیں تھی۔ بس معمول کی لہریں تھیں۔ اسے لگا جیسے تالاب نے آسمان نہیں، صرف اسی کو اپنے اندر سمو رکھا ہو۔ وہ فخر سے بولا:

"دیکھو، حقیقت ہمیشہ وہی ہوتی ہے جو دنیا دیکھتی ہے۔"

محافظ نے بظاہر مرعوب نظروں سے ڈریکس کو دیکھا۔ اور اسی وقت اسے کوے کی آواز آئی۔ ایک کالا کلوٹا کوا تالاب کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ اس کی چونچ میں ایک کنکر تھا۔ یہ بہت غیر معمولی بات تھی۔ ڈریکس نے بندوق اٹھائی نشانہ لیا مگر اس سے پہلے ایک عجیب بات ہوگئی۔ کوے نے بندوق دیکھ کر کائیں کائیں کرنے کے لیے منہ کھولا۔ کنکر اس کی چونچ سے نکلا اور پانی میں گر پڑا۔ لہریں پیدا ہوئیں اور ڈریکس کا عکس پہلے تھرتھرایا اور پھر پانی میں غائب ہو گیا۔

محافظ نے مسکراتے ہوئے مالک کی طرف دیکھا مگر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اسی لمحے اسے ملینا کا وہ جملہ یاد آیا:

"دوستی اور تابع داری میں فرق ہوتا ہے۔۔۔ اگر کوئی شخص ایک تصویر کو اپنی برتری کا ثبوت بنانے لگے تو مسئلہ تصویر میں نہیں، اس کی سوچ میں ہوتا ہے۔"

معاذ بن نور

کھیتی

کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک بچہ ہر چیز فوراً چاہتا ہے، جب کہ ایک بالغ صبر سے کام لیتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ کچھ وقت لگتا ہے؟ زندگی فوری تسکین کا نام نہیں ہے۔ جیسے ایک ذہین اور محنتی کسان آج بیج بوتا ہے اور صبر سے کل کے اچھے پھل کی توقع کرتا ہے، ہمیں بھی آج محنت کرنی ہے تاکہ کل بہتر نتائج حاصل کر سکیں۔ یہی زندگی کا وظیفہ ہے، جو دنیا اور آخرت میں کامیابی کا باعث بنتا ہے۔ جیسے جیسے ہم بالغ ہوتے ہیں، ہم اس قانون قدرت کو دریافت کر لیتے ہیں کہ آج کی قربانیوں کا صلہ کل ملتا ہے، اور یہی پایدار کامیابی کی راہ ہے۔ قرآن ہمیں یاد دلاتا ہے:

"اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو۔ اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔" (الحشر ۵۹:۱۸)

آپ بھی اپنے آپ سے پوچھیں کہ میں نے اپنے خالق، اپنے آپ، اپنے والدین، بیوی، بچوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھے تعلق کے لیے آج کیا قربان کیا ہے؟ کیا آپ ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو بیج کی طرح سمجھتے ہیں؟ آپ ان سے فوراً صلے کی توقع کرتے ہیں یا آپ ان کے ساتھ تعلق کو صبر کے ساتھ ایک کامیاب کسان کی طرح پروان چڑھاتے ہیں؟

دوسری بات یہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ایک اچھے کسان کا ارادہ، عمل اور متوقع نتیجہ حقائق کی روشنی میں باہم مربوط ہوتے ہیں، جس کی بنیاد پر وہ اپنی محنت پر ایک حد تک اعتماد رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارے رشتوں سے متعلق معاملات میں ہمارے ذہنوں میں پیدا ہونے والے ارادوں، عمل اور متوقع نتائج کا حقائق کی بنیاد پر مربوط ہونا اور ان کے بار آور ہونے پر ہمارا ایک حد تک اعتماد ہونا تعلقات کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہے۔

جب ارادے، عمل اور متوقع نتائج محض جبلی خواہشات نہیں، بلکہ سچائی کے مطابق ہوں تو وہ باہم مربوط ہو کر ایک

سیدھی راہ تشکیل دیتے ہیں۔ ہم اپنی زندگیوں میں اس ہم آہنگی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں قلب و ذہن کا ارتکاز حاصل ہوتا ہے، نتائج درست ہوتے ہیں اور اپنی محنت کے درست ہونے پر ہمارا اعتماد مزید بڑھتا ہے۔ اس سیدھی راہ کی موجودگی میں جب شیطان خواہشات اور جذبات کو بھڑکاتا ہے تو ایک مومن فوراً ان انحرافات کو پہچان کر ان کو درست کرتا ہے، جس سے اس کے عمل میں اعتماد بحال ہوتا ہے۔ سچائی سے انسان کے ارادوں، افعال اور متوقع نتائج کا یہ تعلق نہ ہو تو انسان کے لیے اپنی محنت پر یہ بنیادی اعتماد حاصل کرنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

شیطان انسان کی جبلتوں اور جذبات کو انگیخت کر کے مسلسل کوشش میں رہتا ہے کہ انسان کے ارادے، افعال اور متوقع نتائج باہم متناقض ہوں اور سچائی سے ہٹ جائیں، جب کہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ سچائی اور انصاف کے مطابق ہوں۔ اسی لیے اللہ نے ہمیں سننے، دیکھنے کی صلاحیت اور عقل دی تاکہ ہم صحیح اور غلط میں تمیز کر سکیں اور اپنے ارادوں کو نیک اور سچا بنا کر درست افعال سے اور درست افعال کو حقیقت پسندی پر مبنی متوقع نتائج سے جوڑ سکیں:

''اور اس نے تمھیں سننے، دیکھنے اور (سمجھنے کے لیے) عقل دی (مگر تم اپنے ہوائے نفس کی پیروی کرنے لگے)؛ تم کم شکر گزار ہو۔'' (السجدہ ۳۲:۹)

یہی وجہ ہے کہ ہم اکثر اس وقت رشتوں اور تعلقات کو بہتر کرنے کے لیے اپنی محنت پر اعتماد کھو بیٹھتے ہیں جب ہم اچھی نیت اور محنت کے ساتھ بوائی کا کام کیے بغیر ہی شیطان کی اکساہٹ پر (کہ تو نے اب بہت کر لیا) کٹائی کی توقع کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سچائی کی راہ کو چھوڑ کر صرف جذبات اور خواہشات کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔

تیسری بات یہ ذہن نشین رہے کہ تعلقات میں اختلافات آتے ہیں، جیسے ایک اچھا کسان فصل کو لاحق خطرات سے عقل کو بھرپور استعمال میں لاتے ہوئے صبر و استقامت اور توکل علی اللہ کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے، لیکن ہم ایک ذہین کسان کی طرح رشتوں اور تعلقات میں پیدا ہونے والے مسائل پر غور کرنے کے بجائے شیطان کے بہکاوے میں آکر اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھتے، پھٹ پڑتے اور اناؤں کی جکڑبندیوں کے غلام بن کر انمول رشتوں اور تعلقات کو کھو بیٹھتے ہیں۔

شیطان کے اس پھندے سے بچنے کے لیے آپ ہمیشہ یہ سوال اپنے آپ سے کرتے رہیں کہ کیا آپ کٹھن سے کٹھن ترین حالات میں بھی دوسروں کی تنقید کو عاجزی سے سن رہے ہیں؟ یہ مانتے ہوئے کہ بدترین انسان کی بات میں بھی میرے لیے حقیقت اور بہتری کا کوئی پہلو ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اس بنیاد پر تنقید کو رد کر دیتے ہیں کہ اس شخص سے مجھے کسی خیر کی توقع نہیں تو یہ تکبر ہے، ہم شیطان کے نزغ میں مبتلا ہو کر غرور اور فریب میں پڑ جاتے ہیں اور

حکمت قرآن

تعلقات میں بہتری کا دروازہ اپنے ہی ہاتھوں سے بند کر دیتے ہیں۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں بغض کے بجاے دھیان سے اور تکبر کے بجاے عاجزی سے بات کو سننا چاہیے:

”جو لوگ بات سنتے ہیں اور اس میں سے بہترین بات کو اختیار کرتے ہیں۔“ (الزمر ۳۹:۱۸)

زندگی کے ہر پہلو میں، خاص طور پر ہمارے رشتوں اور تعلقات میں ہمیں چاہیے کہ ہم خدمت، حقیقت پسندی، خود اعتمادی، صبر اور عاجزی کا جذبہ اختیار کریں۔ ہمیشہ خود پر نگاہ رکھیں کہ کیا آپ ان لافانی اصولوں کی بنیاد پر تعلقات میں بہتری کے بیج بوتے ہیں یا انا اور جلد بازی کے ہاتھوں رشتوں اور تعلقات میں بہتری کو جڑ سے اکھاڑ دیتے ہیں؟

اللہ ہمیں ایسے دل عطا فرمائے جو سنیں، ایسے دماغ دے جو غور کریں اور ایسی روحیں دے جو عاجزی کو اپنائیں۔

تعلیم و تعلم

ثوبیہ نورین

خیر سے شر تک کا سفر۔ کیسے؟

حسب معمول مصنفہ نے اس مضمون کو ایک لیبارٹری بنا دیا ہے اور والدین اور اساتذہ اس میں اپنے تجربات کے نتائج دیکھ سکتے ہیں۔

ہم پڑھتے بہت ہیں، سنتے بھی بہت ہیں، مگر شاید اتنا سوچتے نہیں جتنا سوچنا چاہیے۔

یہ گیارہ بارہ سال کے دو بچوں، علی اور احمد، کی کہانی ہے۔ دونوں ساتویں جماعت میں پڑھتے ہیں اور اچھے دوست ہیں۔ علی ایک خوش مزاج بچہ تھا، مگر پچھلے ایک دو برسوں نے اس کی شخصیت پر گہرے اثرات ڈالے تھے۔ وہ اکثر اندر ہی اندر ایسی سوچوں، اندیشوں اور پریشانیوں میں گھرا رہتا جنھیں وہ خود بھی پوری طرح سمجھ نہیں پاتا تھا۔ اب دیکھیے، علی اور اس کے ماحول کے مسائل کو ہم سمجھ پاتے ہیں یا نہیں۔

اسکول میں پانچواں پیریڈ چل رہا تھا۔ اسلامیات کا ٹیسٹ ہونا تھا۔ بچے ٹیسٹ کے خوف سے دعائیں کر رہے تھے کہ کاش ٹیچر آج نہ آئیں۔ کوئی کہتا:

"اللہ کرے مس کے پیٹ میں درد ہو جائے۔"

دوسرا بولا:

"نہیں یار، وہ تو آج آئی ہوئی ہیں۔"

تیسرا کہنے لگا:

"اللہ کرے ان کے پاؤں میں موچ آ جائے یا کوئی ٹیچرز میٹنگ ہو جائے۔"

تعلیم و تعلم

کلاس میں کچھ بچے ہنس رہے تھے، کچھ نروس تھے اور کچھ خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک ٹیچر کے قدموں کی آواز آئی۔ سب ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اپنی اپنی ڈیسکوں کی طرف بھاگے۔

اسلامیات کی ٹیچر کلاس میں داخل ہوئیں تو خاموشی چھا گئی، مگر ہلچل ابھی باقی تھی۔ بچے سلام کرنے ہی والے تھے کہ ٹیچر نے کہا:

وقت ضائع کیے بغیر شیٹس نکالیے اور ٹیسٹ شروع کیجیے۔ آج مجھے امانت کا باب بھی پڑھانا ہے۔ بیس منٹ میں ٹیسٹ مکمل کریں۔

آج "صداقت" کے سبق کا ٹیسٹ تھا۔ ٹیچر نے بورڈ پر سوال لکھنا شروع کیے:

سوال نمبر ۱: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا کوئی ایک واقعہ لکھیے۔

سوال نمبر ۲: صداقت کا لغوی مفہوم اور تفصیلی وضاحت کیجیے۔ قرآنی آیات کے حوالے دینے پر اضافی نمبر دیے جائیں گے۔

ابھی ٹیچر بات مکمل ہی کر رہی تھیں کہ غفران کی چیخ نکل گئی۔

غفران کلاس کا وہ بچہ تھا جسے اکثر بچے تنگ کرتے رہتے تھے۔ آج بھی ایک بچے نے اسے بال پوائنٹ کی نوک چبھو دی تھی۔ یہ حرکت اتنی اچانک ہوئی کہ وہ درد سے چیخا اور پھر بلک بلک کر رونے لگا۔

ٹیچر برہم ہو گئیں۔

"یہ حرکت کس نے کی ہے؟"

کلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ٹیچر کی آواز بلند ہوتی گئی:

"ٹیسٹ کے وقت ہی آپ لوگوں کی یہ حرکتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جلدی بتائیں، ورنہ پوری کلاس کو لائن بنوا کر پرنسپل آفس لے جاؤں گی۔"

مگر سب خاموش رہے۔ کئی بچوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، لیکن کوئی نہیں بولا۔ علی بھی چپ بیٹھا رہا۔ اس کے دل میں کشمکش شروع ہو گئی۔ بتاؤں یا نہ بتاؤں؟ اسے پچھلی بار کا واقعہ یاد آ گیا جب اس نے نقل کرنے والے لڑکے کا نام بتا دیا تھا۔ اس کے بعد اس لڑکے اور اس کے دوستوں نے کئی دن علی کو تنگ کیا تھا۔ اس کا نام "سچو" رکھ دیا گیا تھا۔ کبھی اس کا لنچ کھا لیا جاتا، کبھی معصوم شکل بنا کر ٹیچر سے اس کی شکایت لگا دی جاتی۔

آج بھی وہی خوف سامنے تھا۔ ساتھیوں کی مخالفت، بدلے کا ڈر، مذاق، تنہائی۔ مگر دوسری طرف غفران کے آنسو تھے۔

علی نے ہمت باندھی ہی تھی کہ کچھ لڑکوں نے اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ فوراً بول اٹھے:

"میم، یہ حرکت علی نے کی ہے!"

علی گھبرا گیا، مگر اس نے فوراً اصل لڑکے کا نام لے لیا:

"میم، اسد نے کیا ہے۔"

لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ ٹیچر کا غصہ علی پر اترنے لگا۔ علی نے صفائی دینے کی کوشش کی، مگر پانچ چھ لڑکوں کی ٹولی ایک آواز ہو کر بولی:

"میم، ہم نے خود دیکھا ہے۔ علی نے کیا ہے۔"

علی نے اسد کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا:

"میم، اس کے ہاتھ میں بال پوائنٹ دیکھیں۔"

اسد نے فوراً بال پوائنٹ نیچے گرایا اور پاؤں سے پیچھے کِک مار دی۔

"میم، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا بال پوائنٹ تو آج گھر رہ گیا ہے۔"

شور بڑھ گیا۔ ٹیچر نے تنگ آ کر علی اور اسد دونوں کو کلاس سے باہر نکال دیا۔ اسد خوش تھا۔ ٹیسٹ سے جان چھوٹ گئی تھی، کیونکہ وہ سبق یاد کر کے نہیں آیا تھا۔ مگر علی کے لیے یہ سزا ایک گہری بے عزتی تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اسے حیرت تھی کہ غفران نے بھی اصل بات نہیں بتائی، احمد نے بھی اس کی سچائی کی گواہی نہیں دی، اور پوری کلاس خاموش تماشائی بنی رہی۔

راہ داری سے گزرتے بچے علی اور اسد کو دیکھ کر ہنستے ہوئے نکل جاتے۔ اسد کبھی تسمہ باندھنے کا بہانہ کرتا، کبھی چلنے کی اداکاری کرتا، تاکہ کوئی اسے سزا کھاتے ہوئے سنجیدگی سے نہ دیکھے۔ اسے معلوم تھا کہ بعد میں گراؤنڈ میں لڑکے مذاق اڑائیں گے:

"اوئے، باہر کیوں کھڑا تھا؟"

"بچو، آج تو تیری امی کو بتاؤں گا!"

اسد ایسے مذاق سے بچنے کے لیے سمارٹ بن رہا تھا، اور علی اندر ہی اندر شرمندگی سے گڑا جا رہا تھا۔ اتنے میں ڈسپلن ٹیچر راؤنڈ پر آتے دکھائی دیے۔ علی مزید گھبرا گیا۔ اسد نے فوراً کلاس ٹیچر سے اندر آنے کی اجازت مانگی:

"میم، میرا بھی ٹیسٹ لے لیں۔"

ٹیچر نے تلخ لہجے میں کہا:

"آج آپ کے زیرو نمبر لگیں گے۔"

اسد فوراً بولا:

"اچھا میم، کتاب تو لینے دیں۔ میں اگلا چیپٹر پڑھ لوں گا۔ میم، پلیز!"

ٹیچر نے بھنویں چڑھا کر کہا:

"لیں کتاب، اور باہر چلے جائیں۔"

اسد کی اصل توجہ کتاب پر نہیں، ڈسپلن ٹیچر پر تھی۔ وہ موقع دیکھ کر کلاس میں گیا اور کھڑکی کے قریب جا کر اپنے دوستوں کو ٹیسٹ دکھانے کی پیش کش کرنے لگا۔ ادھر ڈسپلن ٹیچر علی سے پوچھ رہے تھے:

"کیوں کھڑے ہو باہر؟"

علی کے الفاظ حلق میں اٹکنے لگے:

"سر وہ... سر وہ..."

اسے لگا شاید اب اس کی خلاصی ہو جائے گی۔ اگر وہ سچ بتا دے گا کہ غفران کو اسد نے چھبویا تھا تو سر اسے اندر بھیج دیں گے، اور آتے جاتے بچوں کے مذاق اور اساتذہ کی سرزنش سے جان چھوٹ جائے گی۔

اس نے ہمت جمع کی:

"سر، غفران کو... اس... اسد نے..."

اس کے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔ جسم ایک دم حرارت سے بھر گیا۔ مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔

سر کے پاس بھی تفتیش کا وقت نہیں تھا۔ وہ بولے:

"بیٹا، سدھر جاؤ۔ یہ مستیاں گھر جا کر کیا کرو۔ ورنہ گراؤنڈ کے دس چکر لگواؤں گا۔"

وہ اپنی دانست میں نصیحت کر کے آگے بڑھ گئے۔ علی وہیں کھڑا رہ گیا۔ سر کے جاتے ہی اسد کتاب ڈھونڈنے کی اداکاری مکمل کر کے ہنستا ہوا باہر آ گیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ علی کے چہرے پر خاموش شکست۔

بریک میں علی بجھا بجھا رہا۔ احمد نے اسے بہلانے کی کوشش کی:

"یار، تجھے کیا ضرورت تھی اتنا زیادہ 'سچو' بننے کی؟ چل، کینٹین چلتے ہیں۔"

علی مزید چڑ گیا، مگر کچھ بولا نہیں۔ دن گزرا۔ چھٹی ہوئی۔ علی بچوں سے بھری گاڑی میں ہچکولے کھاتا ہوا کبھی ایک

بچے پر گرتا، کبھی دوسرے پر۔ اس کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا: گھر جا کر امی ابو کو سب بتائے گا۔ پھر اسے ابو کا چہرہ یاد آیا۔ وہ جانتا تھا کہ ابو بہت سوال کریں گے، اور آخر میں ڈانٹ بھی اسی کو پڑے گی۔ امی کو پتا چلا کہ ٹیسٹ چھوٹ گیا ہے تو وہ کھیلنے بھی نہیں جانے دیں گی، بلکہ کہیں گی: "ٹیسٹ یاد کرو۔"

یہ سوچ کر علی نے فیصلہ بدل لیا۔ شام کو علی کے چچا اپنے بچوں کے ساتھ گھر آ گئے۔ کھیل کود شروع ہوا۔ اسی دوران بچوں نے آئس کریم کھانے کا پلان بنایا۔ پیسے کم پڑ گئے تو ایک کزن نے علی سے کہا:

"تو اپنے ابو کے والٹ سے نکال لا۔"

علی جھجکا۔

"میرے ابو تو والٹ جیب میں دبائے بیٹھے ہیں۔"

مگر کزنز کے ساتھ کھیل کا مزہ، ان کی ناراضی کا ڈر، اور دن بھر کی چوٹ ابھی تازہ تھی۔ آخر کار وہ بادلِ نخواستہ گیا، ابو کے والٹ سے ساڑھے تین سو روپے نکالے، اور سب بچے آئس کریم کھائے چلے گئے۔ واپس آئے تو بڑے لاؤنج میں بیٹھے تبصروں میں مصروف تھے۔ یہ منظر ہر گھر کا منظر ہے۔ مگر ذرا سوچیے کہ بچوں کی دنیا، بڑوں کی دنیا، اور حقیقی تعلیم و تربیت کی دنیا کس قدر الگ الگ ہیں۔

ابو کہہ رہے تھے:

"اصل مسئلہ ہمارا سسٹم ہے۔"

چچا بولے:

"نہیں جی، سسٹم بدل بھی گیا تو جب تک عوام نہیں بدلیں گے، کچھ نہیں بدلے گا۔ کرپشن کرنے والے نہیں بدلیں گے۔ پاکستانی قوم ہے ہی بے ایمان، جھوٹی۔۔۔۔"

بچوں کو دیکھتے ہی سب نے پڑھائی کے سوال شروع کر دیے۔ چچا نے علی سے پوچھا:

"ہاں بھئی علی، اسکول کیسا جا رہا ہے؟"

علی اچھے موڈ میں تھا۔ چچا کا آخری جملہ سن کر اس کے دل میں آیا کہ وہ اپنی بے بسی اور بچوں کی بے ایمانی کی داستان سنائے۔ وہ بولا:

"آج چاچو، پتا ہے میرے ساتھ کیا ہوا؟"

ابو فوراً بول پڑے:

"باتیں ان بچوں کی ختم نہیں ہوتیں۔ فوراً کہانیوں میں لگ جاتے ہیں۔"

چچا نے کہا:

"ہاں بھئی علی، کیا ہوا؟"

علی نے کہنا شروع کیا:

"آج اسلامیات کے پیریڈ میں…"

اتنے میں امی کو یاد آگیا:

"آج تو تمہارا گرینڈ ٹیسٹ تھا نا؟ کیا بنا؟"

علی کا رنگ اڑ گیا۔ وہ فوراً پیاس کا بہانہ کر کے کھانستا ہوا پانی پینے چلا گیا۔

اب اگلے بچے کی باری آگئی۔ بچوں کی آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام رسانی شروع ہوگئی۔ یہ وہ پیغامات تھے جو بغیر موبائل کے بھی فوراً ڈیلیور ہو جاتے ہیں۔ چند منٹ میں بچے باری باری وہاں سے کھسک گئے۔

بڑے پھر سنجیدہ گفتگو میں مصروف ہو گئے:

"آج کل پڑھائی سخت ہو گئی ہے۔"

"بچوں پر نظر رکھنی چاہیے۔"

"ان کا آنا جانا کم کرو۔"

"سبق یاد کیا کریں۔"

آج ان کی پڑھائی کا خیال کریں گے تو کل یہی بچے حالات بدلیں گے۔

رات کو علی بستر پر لیٹا تو پورے دن کے مناظر دماغ میں گھومنے لگے۔ اس کے پاس کچھ نامعلوم احساسات تھے، کچھ انجانے خوف، کچھ ان کہے سوال۔

اسے اکثر لگتا تھا کہ وہ کسی اور دنیا کا بچہ ہے، اور باقی سب کسی اور دنیا کے لوگ ہیں۔ وہ سوچتا: میں اپنی بات دوسروں کو کیوں نہیں کہہ پاتا؟ جو بات بھی بتاتا ہوں، بچے مذاق اڑاتے ہیں، بڑے کہتے ہیں: "اچھا بس، یہ فلسفیوں والی باتیں چھوڑو، جا کر پڑھو۔"

یہاں تک کہ اس کے دوست بھی اسے نہیں سمجھتے۔ دوست کا خیال آتے ہی اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ اسلامیات کے پیریڈ کا واقعہ پھر سامنے آگیا۔

وہ سوچنے لگا:

اگر امی نے دوبارہ ٹیسٹ کا پوچھ لیا تو؟ ویسے ٹیسٹ تو مجھے یاد تھا۔ ٹیوشن والی باجی نے ”صداقت“ کے سارے سوال لیے تھے۔

لغوی معنی بھی یاد تھا۔ قرآنی حوالہ جات نہیں آتے تھے، وہ بھی کر لوں گا۔ کل اسد پھر نظر آئے گا۔ اللہ کرے اسد کل نہ آئے۔

مس کبھی میری بات نہیں سنتیں۔ میں نے اسد کا نام بتایا بھی تھا۔ اسد نے کیسے جھوٹ بول دیا؟

اتنے میں قدموں کی آواز آئی۔ امی کمرے کی لائٹ بند کرنے آ رہی تھیں۔

”علی، اب تک جاگ رہے ہو؟“

علی نے فوراً کمبل منہ پر کر لیا۔ امی کے آتے ہی اسے والٹ سے نکالے گئے پیسے یاد آ گئے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے لگا شاید امی کو پتا چل گیا ہے۔ حالاں کہ گھر کے کئی کام نمٹانے کے بعد اس وقت امی کو پیسوں کا کہاں خیال آنا تھا، مگر علی کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ اسے لگا جیسے امی بھی سن رہی ہوں۔ اس نے سوچا، سب بتا دے۔

امی لائٹ بند کر کے جانے ہی والی تھیں کہ علی بول پڑا:

”امی... امی وہ میں...“

امی رک گئیں:

”تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟ میں پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ یہ لڑکا جاگ رہا ہو گا۔“

علی نے ہمت کی:

”امی، ایک بات بتانی تھی۔“

امی کے چہرے پر تھکن اور بیزاری نمایاں تھی۔

”ہاں بولو۔ پھر کوئی گل تو نہیں کھلا دیا؟“

یہ سنتے ہی علی کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔

امی بولیں:

”بولو، میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ تمہارے ابو کا قہوہ چولہے پر ہے۔“

علی اچانک ہنسنے لگا:

”ہی ہی... میں تو مذاق کر رہا تھا۔“

امی نے اسے ہلکی سی چپت لگائی اور مسکراتے ہوئے بولیں:

”تم لوگ انسانوں والی حرکتیں کب شروع کرو گے؟ چلو، سونے کی دعا پڑھو اور سو جاؤ۔“

امی لائٹ بند کر کے چلی گئیں۔

علی نے اسی میں عافیت سمجھی، مگر دل کا بوجھ اور بڑھ گیا۔ نہ جانے کتنے دن اسے اپنے ان ننھے ننھے رازوں کا بوجھ سینے میں لیے پھرنا پڑے گا۔ نہ جانے کتنی راتیں وہ اپنے معصوم اقدام کو بڑوں کی نظر میں ”جرم“ سمجھ کر چھپاتا رہے گا۔

جانے کب علی سو گیا۔

مگر میں علی جیسے ہزاروں بچوں کو جانتی ہوں جن کے سینے ایسے چھوٹے بڑے رازوں سے بھرے پڑے ہیں جن کے لیے ان معصوموں کے پاس الفاظ تک نہیں ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایسے ماحول میں خیر و شر کا درست استعمال سیکھیں گے یا بالکل غلط؟

یہ صرف علی کی کہانی نہیں۔ یہ ہمارے گھروں، اسکولوں اور معاشرے کی کہانی ہے۔

لمحۂ فکر یہ ہم بڑوں کے لیے ہے، جو بڑے کہلاتے ہیں مگر کئی بار چھوٹوں سے بھی چھوٹی حرکتیں کر جاتے ہیں۔

ذرا سوچیے:

اسلامیات کی ٹیچر کے کلاس میں داخل ہونے سے پہلے ان کا خوف کلاس میں کیوں داخل ہو چکا تھا؟

کسی ناخوش گوار واقعے میں اصل اہمیت وقت کی ہے یا انصاف کی؟ فیصلے اکثریت کی آواز پر سنائے جائیں گے یا تحقیق اور شواہد کی بنیاد پر؟ دین کی تعلیم صرف ٹیسٹ لینے کا نام ہے یا عملی زندگی میں اسلام کو نافذ کرنے کا نام؟ اسکولوں، اداروں اور گھروں میں معاملات کیسے طے پا رہے ہیں؟ کسی غلط واقعے کے بعد آواز بلند کر کے، غصہ دکھا کر، بچوں سے بات نکلوانا تربیت ہے یا صبر، نرمی اور گفتگو کا راستہ اختیار کرنا تربیت ہے؟ خوف کی فضا انسان کی نفسیات پر کیا اثر ڈالتی ہے؟ خوف کی موجودگی میں کوئی بچہ یا بڑا سچ بولنے کی ہمت کیسے کرے گا؟ ہم ”خوفِ خدا“ کا تصور بچوں کو کیسے دیں گے، جب ان کی روحوں میں پہلے ہی باپ کا ڈر، استاد کا ڈر، پرنسپل کا ڈر، لوگوں کا ڈر، مذاق کا ڈر اور سزا کا ڈر بٹھا دیا گیا ہو؟

مرد اپنے کھڑوس باس کی موجودگی میں اور عورتیں اپنے ڈانٹنے والے شوہر کی موجودگی میں اپنے معمولی فرائض کس ذہنی کیفیت کے ساتھ ادا کرتی ہیں؟ پھر ہم بچوں سے کیسے توقع کرتے ہیں کہ وہ خوف کے ماحول میں اخلاقی جرأت پیدا کریں گے؟

تعلیم و تعلم

صداقت اور امانت جیسے اسباق کیا صرف یاد کروا کر اور ٹیسٹ لے کر پڑھائے جا سکتے ہیں؟ یا یہ دن بھر کے معاملات کو سن کر، سمجھ کر، سلجھا کر اور بچوں کی سوچ کو ابھار کر سکھائے جانے چاہئیں؟

قرآنی حوالہ جات دینے پر اضافی نمبر ملتے ہیں، مگر کیا ہم نے کبھی سوچا کہ آیات کا حافظہ کلاس روم کے اخلاقی بحران میں کیا کردار ادا کر رہا ہے؟ اگر ایک بچہ سچ بولنا چاہتا ہے اور ہم اس کی سچائی کو خوف، دباؤ اور تضحیک کی نذر کر دیتے ہیں تو معاشرے میں باقی بچی روشنی کے چراغ کتنی تیزی سے بجھ جائیں گے؟ ڈسپلن ٹیچر کا کام صرف راؤنڈ لگانا ہے یا بچوں کو اپنے معاملات میں نظم و ضبط سکھانا؟

اسد جیسے بچے اگر آزاد، بے خوف اور بلا تربیت گھومتے رہیں گے تو کل معاشرے میں بے رحم، جھوٹے اور طاقت کے نشے میں مبتلا کردار کیوں پیدا نہیں ہوں گے؟

کیا ہم نے سوچا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں دوسروں کو ہراساں کرنے والے بچے اکثر ہمارے گھروں کے بڑوں کے رویوں کا عکس ہوتے ہیں؟

ہم والدین اور نام نہاد بڑے بچوں کے جذبات، مسائل اور خواہشات کو جس بے توجہی اور حقارت سے ڈیل کرتے ہیں، اس کے بعد بچے اپنا مسیحا گھر کے باہر تلاش کرنے لگتے ہیں۔ علی کو ''سچو'' کہلوانے پر چڑ ہونے لگی ہے۔ یہ معمولی بات نہیں۔ یہ ایک بچے کے اندر سچائی سے بیزاری کا آغاز ہے۔

وہ سچ بولنا چاہتا ہے۔ وہ ابھی اپنی فطرت کی آواز سن رہا ہے۔ مگر اسے خوف، سختی، ناانصافی اور تضحیک کے ماحول میں بار بار یہ پیغام ملتا ہے کہ سچ بولنا نقصان دہ ہے، خاموش رہنا محفوظ ہے، اور جھوٹ بول کر بچ نکلنا سمجھ داری ہے۔

کل کو اگر معاشرے میں بے حس لوگ بڑھ جائیں تو ذمہ دار کون ہو گا؟

ہم بچوں سے پڑھائی کے سوال کرتے ہیں، نمبر پوچھتے ہیں، سبق یاد کرواتے ہیں، مگر کیا ہم انھیں کسی کی ضرورت پوری کرنا، کسی کو وقت دینا، مشکل میں کسی کے کام آنا، کمزور کا ساتھ دینا، غلط کے سامنے کھڑا ہونا، اور سچائی کی قیمت سمجھنا بھی سکھا رہے ہیں؟

ہم ان کی ننھی خواہشوں، غلطیوں اور کمزوریوں پر فوراً جج بن جاتے ہیں۔ سزا سنانے کو تیار رہتے ہیں۔ مگر تربیت، محبت، گفتگو اور رہنمائی کے وقت ہم مصروف ہو جاتے ہیں۔

یہ رویہ بچوں کی فطرت کا قاتل ہے۔

پھر بھی ہم بڑے ہیں۔ ہمارے علم اور عمل کے تضاد پر سوال کون اٹھائے گا؟ بچوں کی عدالت میں ہم پہلے ہی مجرم ہیں، مگر افسوس یہ ہے کہ اپنے ضمیر کی عدالت میں بھی ہم خود کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کو تیار نہیں۔

یہی ہماری اصل ستم ظریفی ہے۔

گوشہ سخن وری

کلام: حمیرا رحمان

غزل

ذرا سی بات پر ناراض ہونا رنجشیں کرنا
محبت میں اسے آتا نہیں گنجائشیں کرنا

مری بیٹی نے مجھ کو دیکھ کر سیکھا ہے برسوں میں
پرانا آئینہ رکھ کر نئی آرائشیں کرنا

مری المایوں میں قیمتی سامان کافی تھا
مگر اچھا لگا اس سے کئی فرمائشیں کرنا

مجھے بچوں کی آنکھوں میں وہ سارے رنگ ملتے ہیں
جنہیں چھونے سے آئے زندگی کی خواہشیں کرنا

حمیرا دھیان رکھنا ڈوبتے سورج کی آہٹ کا
سدا چڑھتی اترتی دھوپ کی پیمائشیں کرنا

کہانی

عائشہ کلیم

بڑا بھائی

برصغیر کے سماج کے ایک اہم مسئلے پر ایک پر اثر کہانی

سلیم ایک سرکاری ملازم تھا۔ چھوٹا سا خاندان تھا۔ بیوی تھی، دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا تھا۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے اسے ایک بڑی کوٹھی ملی ہوئی تھی، دفتر کی گاڑی بھی تھی اور وہ سہولتیں بھی میسر تھیں جنھیں دیکھ کر لوگ عموماً خوش قسمت سمجھتے ہیں۔

لیکن سلیم کی اصل کہانی اس کوٹھی، گاڑی اور سرکاری رعب داب کی کہانی نہیں تھی۔

اس کی اصل کہانی یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کا بڑا بھائی تھا۔

کہانی

برصغیر کے گھروں میں بڑا بھائی صرف بڑا بھائی نہیں ہوتا۔ وہ کبھی باپ کا بازو بن جاتا ہے، کبھی ماں کا سہارا، کبھی بہنوں کا محافظ، کبھی چھوٹے بھائیوں کا سرپرست، اور کبھی پورے خاندان کا خاموش کفیل۔

سلیم بھی ایسا ہی بڑا بھائی تھا۔

اس کے والد بھی سرکاری ملازم تھے، مگر گھر کی بہت سی امیدیں سلیم سے وابستہ تھیں۔ دو چھوٹی بہنیں تھیں، ایک چھوٹا بھائی تھا، رشتے دار تھے، خاندان تھا، اور سب کی نظریں سلیم پر رہتی تھیں۔

سلیم نے مقابلے کا امتحان پاس کیا تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب سے زیادہ خوش اس کے والد تھے۔ انھیں یوں لگا جیسے ان کے کندھوں کا آدھا بوجھ اتر گیا ہو۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ بوجھ اترا نہیں تھا، صرف ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل ہو گیا تھا۔

اب گھر میں کوئی بھی کام ہوتا، سلیم کو یاد کیا جاتا۔

بہنوں کی شادی کا معاملہ ہو، رشتے داروں کی ناراضی ہو، کسی عزیز کی بیماری ہو، بچوں کے داخلے کا مسئلہ ہو، گھر کی مرمت ہو، خاندان کی عزت کا سوال ہو، ہر طرف سے آواز آتی:

"سلیم سے کہو۔"

اور سلیم خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوتا۔

اس نے اپنی بڑی بہنوں کی شادیاں عزت سے کیں۔ پھر چھوٹی بہنوں کی باری آئی۔ کہیں رشتے دیکھے، کہیں لوگوں کی باتیں سنیں، کہیں خرچ کا بندوبست کیا، کہیں اپنی خواہشیں دبا دیں۔ شادی کے دن سب خوش تھے۔ بہنیں رخصت ہوئیں تو لوگوں نے کہا:

"ماشاءاللہ، سلیم نے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا۔"

مگر کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ اس حق کی ادائیگی میں سلیم کے اپنے کتنے حق رہ گئے۔

وقت گزرتا گیا۔ سلیم کی اپنی شادی ہوئی۔ بیوی گھر آئی تو اسے بھی ایک ایسا شوہر ملا جو گھر میں موجود تو تھا، مگر پورے کا پورا گھر کا نہیں تھا۔ اس کا ایک بڑا حصہ خاندان، رشتے داروں اور ذمہ داریوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

سلیم صبح دفتر جاتا، شام کو تھکا ہوا واپس آتا، مگر آرام اس کے نصیب میں کم ہی تھا۔ کبھی کسی بہن کے گھر کا مسئلہ، کبھی چھوٹے بھائی کی ضرورت، کبھی والدین کی دوا، کبھی کسی رشتے دار کی سفارش، کبھی کسی کی فیس، کبھی کسی کا قرض۔

بیوی کبھی کبھی شکوہ کرتی:

"آپ گھر آکر بھی گھر میں کہاں ہوتے ہیں؟"
سلیم مسکرا کر کہتا:
"بس چند دن کی بات ہے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
مگر یہ چند دن کبھی ختم نہ ہوئے۔

بچے بڑے ہونے لگے۔ بیٹیاں اسکول گئیں، پھر کالج پہنچیں۔ بیٹا بھی پڑھنے لگا۔ سلیم نے اپنی اولاد کے لیے بھی وہی کیا جو ایک باپ کر سکتا ہے۔ اچھی تعلیم، اچھا ماحول، اچھا گھر، اچھی سہولتیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے بچے وہ محرومیاں نہ دیکھیں جو اس نے دیکھی تھیں۔ مگر محرومی کی بھی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی انسان پیسے سے محروم ہوتا ہے، کبھی وقت سے، کبھی محبت کے اظہار سے، کبھی اپنے باپ کی گود سے۔ سلیم کے بچے اسے عزت سے دیکھتے تھے، مگر اس کے قریب کم بیٹھتے تھے۔ وہ ان کے لیے محنت کرتا رہا، مگر ان کے ساتھ زندگی گزارنے کا وقت کم نکال سکا۔

ادھر خاندان کی توقعات ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ایک بہن کے بچوں کا مسئلہ، دوسری کے گھر کی پریشانی، چھوٹے بھائی کی نوکری، والدین کی بیماری، خاندان کی تقریبات، رشتے داروں کی شکایتیں، سب کچھ سلیم کے دروازے پر آکر رک جاتا۔

وہ کبھی انکار نہیں کر سکا۔ شاید اس لیے کہ وہ بڑا بھائی تھا۔ اور ہمارے معاشرے میں بڑے بھائی کو انکار کرنا سکھایا ہی نہیں جاتا۔

اسے بچپن ہی سے بتایا جاتا ہے:
"تم بڑے ہو، تمھیں برداشت کرنا چاہیے۔"
"تم بڑے ہو، تمھیں سمجھ داری دکھانی چاہیے۔"

"تم بڑے ہو، تمھیں قربانی دینی چاہیے۔"

یہ جملے آہستہ آہستہ اس کی شخصیت پر لکھ دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ بڑا ہو کر آدمی نہیں رہتا، ایک ذمہ داری بن جاتا ہے۔

سلیم بھی ذمہ داری بن چکا تھا۔

اس کی اپنی پسند، اپنی تھکن، اپنی تنہائی، اپنی خواہشیں، سب پیچھے رہ گئیں۔ وہ خاندان کا سہارا تھا، مگر خود کس کے سہارے تھا، یہ سوال کسی نے نہ پوچھا۔ کبھی رات گئے وہ دفتر کی فائلیں بند کرتا، عینک اتارتا اور دیر تک چھت کو دیکھتا رہتا۔ بیوی پوچھتی:

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

وہ کہتا:

"کچھ نہیں۔"

حالاں کہ اس "کچھ نہیں" میں بہت کچھ ہوتا تھا۔ اس میں تھکن بھی ہوتی تھی، اداسی بھی، حساب بھی، اور ایک خاموش سوال بھی:

"کیا میری اپنی کوئی زندگی ہے؟"

وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ والد ریٹائر ہوئے، پھر بیمار رہنے لگے۔ والدہ کی کمزوری بڑھ گئی۔ بہنیں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ چھوٹا بھائی اپنی دنیا میں مصروف ہو گیا۔ سلیم کے بچے بھی جوان ہو گئے۔ بیٹیوں کی شادی کا وقت آیا تو سلیم پھر اسی دوڑ میں لگ گیا۔ رشتے، جہیز، انتظام، مہمان، خرچ، عزت، دکھاوا، لوگوں کی باتیں—سب کچھ اس کے سر پر آ گرا۔ اس نے ایک ایک کر کے بیٹیوں کو رخصت کیا۔

لوگوں نے پھر کہا:

"سلیم نے کمال کر دیا۔ بڑا باپ ہے۔ بڑا بھائی ہے۔ بڑا آدمی ہے۔"

مگر سلیم اندر سے چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی صحت جواب دینے لگی تھی۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا، دل کمزور ہونے لگا، نیند کم ہوتی گئی۔ ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا، مگر آرام ان لوگوں کو کہاں ملتا ہے جنھیں ہر وقت کسی نہ کسی کے لیے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔

ایک دن سینے میں شدید درد اٹھا۔ گھر والے گھبرا گئے۔ ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ معلوم ہوا کہ دل پر مسلسل دباؤ نے اثر دکھانا شروع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا:

"سلیم صاحب، اب زندگی کا انداز بدلنا ہوگا۔ کام کم کریں، فکر کم کریں، آرام زیادہ کریں۔"

سلیم نے سر ہلا دیا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یہ مشورہ اچھا ہے، قابلِ عمل نہیں۔ کیونکہ گھر اب بھی تھا، بچے اب بھی تھے، بہنیں اب بھی تھیں، رشتے دار اب بھی تھے، اور سب سے بڑھ کر وہ خود اب بھی بڑا بھائی تھا۔ چند ماہ بعد سلیم اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ جنازے میں بہت لوگ آئے۔ ہر شخص کی زبان پر اس کی تعریف تھی۔

"بہت اچھا آدمی تھا۔"

"سب کے کام آتا تھا۔"

"کبھی کسی کو انکار نہیں کیا۔"

"خاندان کا ستون تھا۔"

لوگ درست کہہ رہے تھے۔ سلیم واقعی ستون تھا۔ مگر ستون کی اپنی کوئی چھت نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کی چھت اٹھائے رکھتا ہے، خود دھوپ، بارش اور اندھیروں میں کھڑا رہتا ہے۔ سلیم کے جانے کے بعد گھر میں کچھ دن خاموشی رہی۔ پھر زندگی آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگی۔ بچے اپنی دنیا میں واپس چلے گئے۔ بہنیں اپنے گھروں میں مصروف ہو گئیں۔ رشتے داروں کی گفتگو میں سلیم کا ذکر کم ہوتا گیا۔

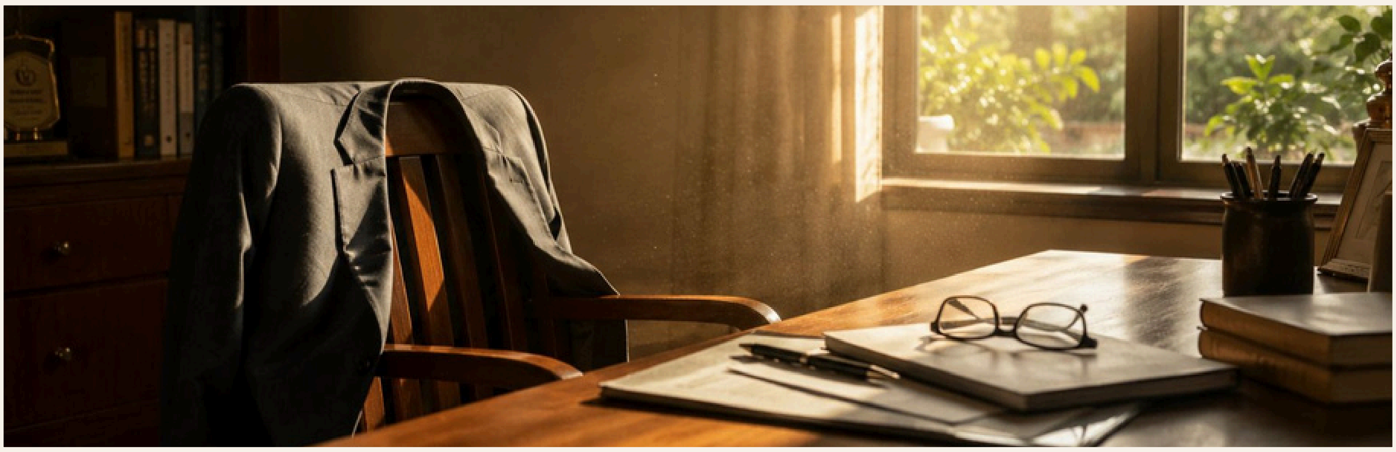

کوٹھی وہیں تھی۔ گاڑی وہیں تھی۔ فرنیچر وہیں تھا۔ فائلیں وہیں تھیں۔ الماری میں اس کے کپڑے بھی لٹک رہے تھے۔ مگر سلیم نہیں تھا۔ اس کی بیوی کبھی کبھی کمرے میں اکیلی بیٹھ کر سوچتی کہ یہ آدمی ساری زندگی دوسروں کے لیے بھاگتا رہا، مگر آخر میں اپنے لیے کیا بچا سکا۔ اس کے پاس عزت تھی، مگر سکون نہیں تھا۔ اس کے پاس رشتے تھے، مگر فرصت نہیں تھی۔ اس کے پاس خاندان تھا، مگر اپنی تنہائی کہنے والا کوئی نہ تھا۔

یہ صرف سلیم کی کہانی نہیں ہے۔

یہ ہمارے معاشرے کے بے شمار بڑے بھائیوں کی کہانی ہے۔ وہ گھر کے پہلے سپاہی ہوتے ہیں۔ والدین بوڑھے ہوں تو ان کا سہارا، بہنیں جوان ہوں تو ان کی فکر، بھائی چھوٹے ہوں تو ان کا راستہ، بچے ہوں تو ان کا مستقبل، خاندان ہو تو اس کی عزت۔

وہ سب کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ان کے لیے بیٹھتے ہیں۔ بڑا بھائی اکثر سب کی ضرورت ہوتا ہے، مگر کسی کی ترجیح نہیں بن پاتا۔ یہی اس کی سب سے بڑی تنہائی ہے۔

ہمیں اپنے گھروں کے بڑے بھائیوں کو صرف ذمہ داری نہیں، انسان سمجھنا چاہیے۔ ان سے مدد لیجیے، مگر ان کا ہاتھ بھی تھامیے۔ ان پر بھروسا کیجیے، مگر ان کا بوجھ بھی بانٹیے۔ ان کی قربانیوں کی تعریف کیجیے، مگر ان کی زندگی کو صرف قربانی نہ بننے دیجیے۔ کیونکہ بڑا بھائی بھی تھکتا ہے۔ وہ بھی روتا ہے۔

وہ بھی چاہتا ہے کہ کوئی اس سے پوچھے:

"تم سب کے لیے جیتے رہے، کبھی اپنے لیے بھی جیے؟"

عائشہ کلیم

وَدھ

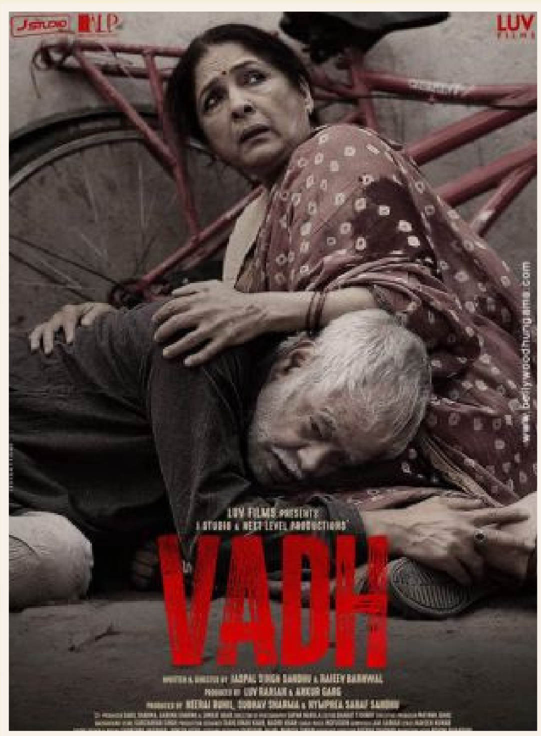

ڈائریکٹر: جسپال سنگھ، راجیو برنوال

پروڈیوسر: لو فلمز

کاسٹ: سنجے مشرا، نینا گپتا، سوربھ سچدیو

"ودھ" کا مطلب ہے قتل۔ اس ہندی فلم کا بظاہر موضوع یہ ہے کہ جب کسی انسان کو انتہائی مجبوری اور بے بسی تک پہنچا دیا جائے تو وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ لیکن اس فلم کے اندر ایک اور بہت اہم اور پریشان کن موضوع بھی چھپا ہوا

ہے، جس پر شاید کم ہی لوگوں نے لکھا ہو یا اپنے جائزوں میں توجہ دی ہو۔ میں اپنے اس تبصرے میں اسی پہلو کی نشاندہی کروں گی۔

فلم کا مرکزی کردار شمبھوناتھ ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ سرکاری اسکول استاد ہے، جو اپنی بیوی منجو کے ساتھ ایک چھوٹے سے شہر میں اپنے پرانے مکان میں رہتا ہے۔ شمبھوناتھ کا ایک ہی اکلوتا بیٹا ہے، جس کا نام گڈو ہے۔ اس نے اپنی بیوی اور بیٹے کی خواہش پر اپنی بساط سے بڑھ کر قرض لیا اور بیٹے کو امریکہ بھیج دیا۔ دونوں میاں بیوی ہر وقت اپنے بیٹے کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ بیٹے کو امریکہ گئے تقریباً چھ سال ہو چکے ہیں۔ کبھی کبھار یہ دونوں بوڑھے والدین سائبر کیفے جا کر پیسے خرچ کر کے اس سے بات کرتے ہیں، مگر ان کے بیٹے کے پاس والدین سے بات کرنے کا بھی وقت نہیں ہوتا۔

گڈو نے امریکہ میں شادی کر لی ہے اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ گڈو کی ماں بار بار اپنے بیٹے سے کہتی ہے کہ تم ہمارے پاس آؤ، ہمارے ساتھ کچھ وقت گزارو اور اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لاؤ، مگر ان کا بیٹا والدین سے بے رخی اختیار کرتا ہے۔ بہو کا رویہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اسے بھی اپنے ساس اور سسر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔

دوسری جانب شمبھوناتھ بری طرح قرضے میں ڈوبا ہوا ہے۔ کسی کو اس کی ابتر حالت پر ترس نہیں آتا۔ گڈو کبھی کبھار والدین کو خرچ کے لیے پیسے بھیج دیتا ہے، مگر خوش دلی سے نہیں بلکہ ایک بوجھ سمجھ کر۔ الٹا وہ والدین سے شکایت بھی کرتا ہے کہ آپ لوگ ہر وقت مجھ سے پیسے مانگتے رہتے ہیں، آخر میرے بھی اخراجات ہیں، میں نے بھی گھر خریدا ہے وغیرہ۔

بیٹے کی اس مسلسل بے رخی سے تنگ آ کر آخر کار شمبھوناتھ اپنا سائبر کیفے والا اکاؤنٹ بند کرا دیتا ہے۔ ایک بوڑھے اور دکھی باپ کی ساری امیدوں پر اس کے بیٹے نے پانی پھیر دیا ہوتا ہے۔

فلم کے اس پہلو پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بہت سے بوڑھے، بے بس اور لاچار والدین ہمیں اپنے معاشرے میں بھی ارد گرد کثرت سے نظر آتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر والدین کا کیا قصور ہوتا ہے کہ ان کی اولاد ان سے بے پروا ہو کر ایسا برتاؤ کرے؟ آخر کیوں والدین اپنی ساری زندگی کی جمع پونجی اور اپنی جوانی اولاد پر لٹانے کے بعد بڑھاپے میں اس طرح کے برے سلوک کے مستحق قرار پاتے ہیں؟

البتہ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ کیا والدین کو اپنی اولاد کی ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کرنی چاہیے؟ کیا والدین کا یہ فرض نہیں کہ وہ اولاد کو سمجھائیں اور انہیں سکھائیں کہ اپنی چادر کے اندر پاؤں کیسے پھیلائے جاتے ہیں؟ اولاد کو یہ بھی سکھانا چاہیے کہ زندگی صرف خواہشات کا نام نہیں بلکہ ذمہ داری، محنت اور شکر گزاری کا نام بھی ہے۔

فلم پر تبصرہ

شمبھوناتھ کو قرضہ دینے والے غنڈے نے بھی بے حد پریشان کر رکھا ہوتا ہے۔ وہ آئے دن اسے دھمکیاں دیتا ہے اور اس کی کمائی بھی چھین لیتا ہے۔ غرض بیچارے مجبور اور بے بس شمبھوناتھ کی زندگی ایک نرک بن جاتی ہے۔ روز روز کی بے عزتی، بے بسی اور ظلم سے تنگ آکر وہ آخرکار اس غنڈے کو قتل کر دیتا ہے۔

اس کے بعد شمبھوناتھ اپنے بیٹے سے بھی رابطہ منقطع کر دیتا ہے، کیونکہ اس کے بیٹے نے اسے بہت مایوس کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنا پرانا مکان اپنی ایک شاگرد نینا کے نام کر دیتا ہے، جس پر اسی غنڈے نے بری نظر ڈالی ہوتی ہے، اور پھر اپنی بیوی کے ساتھ کسی گمنام جگہ پر چلا جاتا ہے۔

فلم کی سب سے بڑی خوبی اس کے اہم کرداروں کی شاندار اداکاری ہے۔ سنجے مشرا اور نینا گپتا نے بے بس، لاچار اور حالات سے مجبور بوڑھے والدین کا کردار بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ خاص طور پر سنجے مشرا کی اداکاری دل کو چھو لیتی ہے۔ ولن کے کردار میں سوربھ سچدیو نے بھی کمال کر دیا ہے۔ اسے دیکھ کر واقعی اس کردار سے نفرت محسوس ہوتی ہے، بلکہ اس کے حلیے اور انداز سے بھی گھن آتی ہے۔ یہی ایک اچھے اداکار کی کامیابی ہے کہ وہ اپنے کردار کو اتنا حقیقی بنا دے۔

یہ فلم صرف ایک کہانی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ یہ حقیقت ہمیں سکھاتی ہے کہ بڑھاپا زندگی کا ایک حقیقی مرحلہ ہے۔ اسے سنجیدگی سے لینا چاہیے، مگر جوانی میں اکثر لوگ اس سے بے پروا رہتے ہیں۔ وہ بڑھاپے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کرتے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ بیٹے ہیں، وہ سنبھال لیں گے۔ مگر حقیقت میں ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اولاد جوان ہو کر اکثر والدین کی ذمہ داری اٹھانے سے لاپرواہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان جوانی ہی میں اپنے بڑھاپے کے لیے مناسب اور معقول منصوبہ بندی کرے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی آمدنی کا کچھ حصہ بچوں سے الگ ضرور محفوظ رکھے۔ بڑھاپے میں اپنا رہنے کا ٹھکانہ قائم رکھے۔ کوئی مناسب نوکری، کام یا چھوٹا موٹا کاروبار بھی ہو تو بہتر ہے، تاکہ بڑھاپے میں انسان آمدنی کی فکر سے کسی حد تک آزاد رہے۔

فلم کی موسیقی بھی کہانی میں موجود سسپنس کو مزید ابھارتی ہے۔ خاص طور پر قتل کے موقع پر پس منظر کی موسیقی کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ اداکاروں کا انتخاب بھی بہت اچھا ہے۔ ہر اداکار اپنے کردار میں نگینے کی طرح جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

فلم پر تبصرہ

یہ فلم آپ کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ آخر کیوں ہم اپنی اولاد سے اتنی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں، جن پر پورا اترنے میں وہ اکثر ناکام ہو جاتی ہے؟ فلم کا اصل موضوع شاید یہی ہے کہ کوئی بھی انسان انتہائی قدم تبھی اٹھاتا ہے جب وہ بہت زیادہ بے بس اور مجبور ہو جائے۔

لیکن بحیثیت مسلمان ہمیں امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہمیں اپنی اولاد پر چھوٹی عمر ہی سے ایسی ذمہ داریاں ڈالنی چاہییں جو ان کی عمر کے مطابق ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر ان کی مناسب اور متوازن رہنمائی بھی کرنی چاہیے۔ انہیں یہ سمجھانا چاہیے کہ اصل کامیاب لوگ وہ ہوتے ہیں جو ذمہ دار انسان بنتے ہیں؛ وہی لوگ دنیا کی زندگی میں بھی عزت پاتے ہیں اور آخرت میں بھی کامیابی کا تاج پہن سکتے ہیں۔